سورج کو نکلتا دیکھوں

(کلیاتِ شہریار)

شہریار

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

سورج کو نکلتا دیکھوں

(کلیاتِ شہریار)

شہریار

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

SOORAJ KO NIKALTA DEKHOON
(KULLIYAT-E-SHAHARYAR
BY
SHAHARYAR

Ist Edition: 2013
Price : .... .500/-

Published by
Educational Book House
Muslim University Market
Aligarh-202002 (India)

پہلا ایڈیشن : 2013
قیمت : -/500
مطبع : ایم۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

ISBN-13 978-93-83549-07-8

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

فہرست

غزلیں

غزلیں

نثری نظمیں

حرف تازہ

نظمیں

غزلیں

غزلیں

نظمیں

باقیات

غزلیں

نظمیں

○○○

دیباچہ

چھ مجموعوں پر مشتمل یہ کتاب ''سورج کو نکلتا دیکھوں'' ہندستان میں پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ اس کی کمپوزنگ کی دیکھ ریکھ میں بیدار بخت نے بہت محنت کی ہے۔ اس کی اشاعت کو ممکن بنانے میں سرور الہدیٰ کا بہت اہم رول ہے میں ان کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں ان کے احسانات تو بے پناہ ہیں ایسے محبت کرنے والے لوگ بھی اس زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ خدا ان کو سلامت اور خوش رکھے۔ دیباچہ بیدار بخت نے لکھا ہے اس کے سو فیصدی ذمہ دار وہ خود ہیں۔ میرے چھوٹے بیٹے فریدون شہریار نے اس کی اشاعت کے لیے بار بار اکسایا، یہ کتاب منظرِ عام پر بڑی حد تک اس کے اصرار اور اشتیاق کا نتیجہ ہے۔ کتاب کی اشاعت میں بڑے مرحلے پیش آتے ہیں ان سب سے بہ آسانی گزر جانے میں کئی لوگوں نے میری مدد کی۔ میں ان سب کا نام بنام شکریہ ادا نہیں کر رہا ہوں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھ سے محبت کرنے والے اتنے لوگ ہیں کہ میرا ہر کام بہ آسانی ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں بیدار بخت اور سرور الہدیٰ کا بنیادی رول ہے۔ ان اصحاب کے لطف خاص کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔ طول کلامیِ نثر * کا میں کبھی قائل نہیں رہا اور

اپنے بارے میں تو سخنِ مختصر * سے بھی ہمیشہ احتراز کرتا رہا ہوں۔ پیش لفظ کے طور پر بیدار بخت کا جو مضمون شامل ہے اس کے ذمہ دار وہ اور صرف وہ ہیں۔ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کو مستحق سلوک سے نوازیے۔

شہریار
۱۰۱ سفینہ کامپلیکس، میڈیکل روڈ
علی گڑھ، یوپی، ہندستان
۵ جولائی، ۲۰۱۱

یہاں ہے طول کلامی نثر کا سکہ یہاں مرے سخنِ مختصر کی قیمت کیا
جذبی

شہریار

کئی سال پہلے، کراچی کے اخبار ڈان میں شہریار پر ایک مضمون چھپا جو ان کے ایک مصاحبے پر مبنی تھا۔ مضمون نگار نے شروع میں اس کا اعتراف تو کیا کہ شہریار کی ادبی حیثیت ایک 'فلمی شاعر' کے مرتبے سے بہت زیادہ بلند ہے، مگر مضمون میں سوائے فلموں، فلم والوں اور غزل گانے والوں کے اور کوئی بات نہ تھی۔ میں نے شکایتاً شہریار سے اس مضمون کا ذکر کیا کہ اس میں ان کی غیر فلمی شاعری کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ شہریار کے جواب میں کوئی تلخی نہیں تھی: 'بھئی انھوں نے جو مجھ سے پوچھا میں نے جواب دے دیا۔' مجھے خیال آیا کہ یہ بے نیازی تو شہریار کی شخصیت کی خاصیت بھی ہے اور ان کی شاعری کی وجہِ امتیاز بھی۔ مجروح سلطانپوری جیسے تیز مزاج والے شاعر سے کوئی نامہ نگار ایسے سوال کرتا جو شہریار سے کیے گئے تو جوابات شاید نا قابلِ اشاعت ہوتے، مگر شہریار تو زندگی اور شاعری دونوں میں کم بیانی کے قائل ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی، انھوں نے ''خود کو گفتگو یا دلچسپی کا محور بنانا سیکھا ہی نہیں۔''

علی گڑھ میں شہریار کی یونیورسٹی تعلیم کا عرصہ تقریباً وہی تھا جو میرا تھا، مگر وہاں ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ میں انھیں ایک چھریرے بدن کے خوبرو کھلاڑی کی حیثیت سے جانتا تھا، جو گھنٹوں این آر ایس سی کلب میں بیڈمنٹن کھیلا کرتا تھا۔ ہمارے ایک کامریڈ دوست

انھیں کنور صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ شاعر شہریار سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ میگزین میں ہوئی، جو ۱۹۶۰ یا ۱۹۶۱ میں چھپا تھا۔ ان کی دو مختصر نظمیں آل احمد سرور، اخترالایمان، سلام مچھلی شہری، منیب الرحمٰن اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں کے ساتھ چھپنے کی وجہ سے خاص توجہ کی طالب ہوئیں، اور ان کے ادبی مرتبے کا خاطر خواہ رعب پڑا۔ ایک نظم 'شہر اور گاؤں' کے عنوان سے چھپی تھی اور دوسری 'انسان' کے عنوان سے۔ 'شہر اور گاؤں' اس طرح شائع ہوئی تھی:

یہاں کیا ہے برہنہ تیرگی ہے
خلا ہے، آہٹیں ہیں، تشنگی ہے
یہاں جس کے لیے آئے تھے وہ شے
کسی قیمت پہ بھی ملتی نہیں ہے
جو اپنے ساتھ ہم لائے تھے وہ بھی
یہیں کھو جائے گا گر کی نہ جلدی
چلو جلدی چلو اپنے مکاں کے
کواڑوں کی جبیں پر ثبت ہوگی
کوئی دستک ابھی بیتے دنوں کی
یہاں کیا ہے برہنہ تیرگی ہے
خلا ہے، آہٹیں ہیں، تشنگی ہے

یہ نظم اخترالایمان کی نظم 'پرانی فصیل' کے آہنگ کی یاد دلاتی ہے، جس کے دو مصرعے ذیل میں درج ہیں۔

یہاں اسرار ہیں، سرگوشیاں ہیں، بے نیازی ہے
یہاں مفلوج تر ہیں تیز تر بازو ہواؤں کے

اخترالایمان کی طرح شہریار بھی اپنے شعر میں ردّوبدل کرتے رہتے ہوں گے۔ ۱۹۶۵ میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'اسمِ اعظم' کے نام سے شائع ہوا، جس میں اوپر لکھی ہوئی نظم 'واپسی' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ آخری دو مصرعے جو پہلے دو مصرعوں کی تکرار تھے، حذف

کر دیے گئے۔ دوسری نظم 'انسان' شعری مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ دو مصرعوں کا حذف کرنا اور ایک نظم کا شعری مجموعے میں شامل نہ کرنا شہریار کی خود احتسابی کی دلیل ہے، اور نظم کا عنوان بدلنا اس پختگی کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت شاعر کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ شعر کے معنی کو کسی طور بھی محدود کرنا شعر کے درجے کو پست کرنے کے مترادف ہے۔

کنور اخلاق محمد خاں ۱۶ جون ۱۹۳۶ میں ضلع بریلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں آنولہ میں ایک پولیس انسپکٹر کے ہاں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ میں والد کے ساتھ علی گڑھ آئے، اور ۱۹۵۴ میں وہیں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس کے ایک سال بعد، جب اس خوبرو نوجوان کی عمر ۱۹ برس کی تھی، اس نے اپنا گھر چھوڑ کر خلیل الرحمن اعظمی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ خلیل صاحب کی عمر اس وقت کوئی ۲۸ سال کی تھی۔ جب میں ۱۹۵۶ میں علی گڑھ گیا تو وہاں امرد پرستی کا چلن عام تو نہ تھا، مگر اشارے ضرور ہوا کرتے تھے اور اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر بظاہر سنجیدہ لوگ بھی روا سمجھتے تھے۔ خلیل صاحب اور شہریار کی دوستی کے بارے میں بھی کچھ افواہیں علی گڑھ میں گردش کیا کرتی تھیں۔ عجب نہیں کہ کئی سال پہلے ایسی ہی افواہیں خلیل الرحمن اعظمی اور معین احسن جذبی کے بارے میں بھی پھیلی ہوں، جب نوجوان خلیل الرحمن نے عمر میں پندرہ سال بڑے جذبی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا۔

خلیل الرحمن اعظمی کی دور رس نگاہ نے کنور اخلاق محمد خاں کی خداداد طبعِ شاعری کو دیکھ لیا تھا۔ انھیں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ جب شاذ تمکنت نے ان کے 'قصباتی' نام پر اعتراض کیا تو کنور صاحب نے، خلیل صاحب کے مشورے پر، اپنا شعری نام شہریار کر لیا۔ اب شہریار ان کا خاندانی نام بھی ہو گیا ہے۔

شہریار نے پہلا شعری مجموعہ، اسمِ اعظم، خلیل الرحمن اعظمی کے نام معنون کیا، یہ کہہ کر کہ: عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں۔ جب خلیل الرحمن اعظمی کی تاریخ ساز کتاب، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، پہلی بار ۱۹۵۷ میں شائع ہوئی تو انھوں نے اس کا انتساب شہریار کے نام کیا۔ 'اسم اعظم' اور خلیل صاحب کا شعری مجموعہ 'نیا عہد نامہ' تقریباً ایک ساتھ ہی شائع ہوئے۔ راہی معصوم رضا نے دونوں مجموعوں کے ناموں کے بارے میں

یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ ایک نے اپنے کلام کو اسم اعظم کا رتبہ دے دیا اور دوسرے نے اپنے مجموعے کو انجیلِ مقدس کا نام دے دیا۔

شہریار کو خلیل الرحمٰن اعظمی سے اتنی شدید عقیدت اور محبت ہے، جیسی شاید امیر خسرو کو اپنے پیر و مرشد نظام الدین اولیا سے رہی ہوگی۔ شہریار کا ایک جامع انتخاب ساہتیہ اکادمی نے 'دھند کی روشنی' کے عنوان سے ۲۰۰۳ میں چھاپا۔ اس کے مختصر سے دیباچے میں شاعر نے اعتراف کیا ہے کہ ''میں جو کچھ بھی ہوں جیسا بھی ہوں وہ صرف اور صرف خلیل الرحمٰن اعظمی کا فیضان ہے۔'' شہریار نے خلیل صاحب کا پس مرگ دیوان 'زندگی اے زندگی' کے نام سے ان کے شاگرد ابوالکلام قاسمی کے ساتھ مل کر ترتیب دیا۔ چار پانچ سال پہلے شہریار کی مرتب کی ہوئی خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین کی دو جلدیں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیں۔

'اسم اعظم' پر ندا فاضلی کا تبصرہ اور 'نیا عہد نامہ' پر سردار جعفری کا تبصرہ خود ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے 'گفتگو' میں ایک ساتھ چھپے۔ ندا فاضلی نے لکھا کہ ''اسم اعظم ایک نئے اور اچھے شاعر کے تجربات و احساسات کا پہلا خوبصورت کتابی روپ ہے۔ اس میں زندگی کے اوپری پردوں کے پیچھے ہونے والے ڈرامے کی رازداری کی لے تو مدھم ہے لیکن تاثر کی دھیمی دھیمی آنچ اور فکر و خیال کی تازگی ہر جگہ نمایاں ہے۔'' شہریار کے پہلے مجموعے کا پیش لفظ وحید اختر نے لکھا جس میں انھوں نے موصوف کو ایسے شاعروں میں شمار کیا تھا جنھیں 'وقت کی آواز کہا جا سکتا ہے۔' کتاب کے فلیپ پر آل احمد سرور اور مغیب الرحمٰن نے بھی شہریار کی شاعری کو سراہا تھا۔ غرض یہ کہ شہریار اپنے پہلے دیوان کی اشاعت کے بعد اردو دنیا کے چند اچھے جدید شاعروں میں شمار کیے جانے لگے۔ دیوان کی اشاعت سے پہلے بھی وہ خاصے مشہور تھے۔ علی گڑھ اور یوپی، دہلی کے ادبی حلقوں میں ان کی خاصی دھوم تھی۔ عجب نہیں کہ کچھ دوشیزائیں اپنے تکیے کے نیچے ان کی تصویر نہیں تو ان کی نظمیں رکھتی ہوں گی۔ علیگڈھ یونیورسٹی کے برآمدوں میں اب بھی یہ افواہ نما راز سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے کہ 'ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں' والی غزل، جو بعد میں ایک فلم کے گانے کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئی، ایک ایسی ہی دوشیزہ کے لیے لکھی گئی تھی۔

'اسم اعظم' کی اشاعت کے وقت، شہریار انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ میں لٹریری اسسٹنٹ تھے، جہاں ان کے فرائض میں انجمن کے رسالوں 'اردو ادب' اور 'ہماری زبان' کی ادارت بھی تھی۔ ۱۹۶۵ میں ان کا تقرر علی گڑھ یونیورسٹی کے اردو شعبے میں لیکچرار کے طور پر ہوگیا۔ اس زمانے میں آل احمد سرور اس شعبے کے صدر تھے۔ شہریار سرور صاحب کے گھر کے فرد کی طرح تھے۔ آج بھی سرور صاحب کی نواسی، درخشندہ جلیل، انھیں ماموں کہہ کر پکارتی ہے، اس نسبت سے کہ سرور صاحب کے بڑے صاحبزادے، صدیق احمد صدیقی، شہریار کو بھائی کی طرح عزیز ہیں۔ میں نے رخشندہ کو شہریار کی صحت کے بارے میں بیٹی کی طرح فکر مند ہوتے دیکھا ہے۔ شہریار کی دوستیاں اور رفاقتیں ہمیشہ کے لیے ہوتی ہیں۔

شہریار کو ایک عشق تو شاعری سے تھا، دوسرا عشق ملیح آباد کی ایک ملیحہ نجمہ محمود سے ہوا، خود موصوفہ کی پیش قدمی کی باعث۔ ۱۹۶۸ میں امتحان کا وقت آیا کہ جیب میں پیسے اس کی اجازت دیتے تھے کہ یا تو ملیحہ سے شادی کی جائے یا اپنا دوسرا مجموعہ چھپوایا جائے۔ معروف نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے شہریار کی مشکل شعری مجموعے کی اشاعت کا ذمہ لے کر آسان کردی۔ اگر اردو دنیا میں کوئی شادی 'ادبی' ہوسکتی ہے تو وہ شہریار کی ہوئی۔ ۱۹۶۸ میں ادیبوں کا ایک قافلہ، جس میں آل احمد سرور اور منیب الرحمٰن جیسے کہنہ مشق ادیب بھی تھے اور شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ہاشمی اور نیر مسعود جیسے نئے ادب کے علمبردار بھی، شہریار کے ساتھ ملیح آباد گیا اور نجمہ محمود کو نجمہ شہریار بنا کر واپس علی گڑھ لایا۔ اس پریوں کی کہانی کی شادی کا چرچا اردو ادبی حلقوں میں مدت تک رہا۔

۱۹۶۹ میں شہریار کا دوسرا شعری مجموعہ، ساتواں در، شمس الرحمٰن فاروقی کے شب خون کتاب گھر، الہ آباد، نے شائع کیا۔ یہ کتاب صدیق احمد صدیقی کے نام معنون ہے، مگر کتاب کے آخری تیس کے قریب صفحے 'حرفِ تازہ' کے عنوان سے نجمہ شہریار کے نام ہیں۔ کتاب کی پشت پر صدیق احمد صدیقی کی کھینچی ہوئی ایک نیم رخی تصویر ہے جس میں شہریار علی گڑھ کے اردو کے ایک استادِ کی بجائے امریکی فلموں کے ایک اداکار نظر آتے ہیں۔ اس کتاب پر اتر پردیش کی اردو اکادمی نے ایک انعام دیا۔

شہریار کا تیسرا شعری مجموعہ 'ہجر کے موسم' کے نام سے ۱۹۷۸ میں چھپا۔ انتساب نجمہ شہریار کے نام ہے، اس شعر کے ساتھ:

آنکھوں میں تیری دیکھ رہا ہوں میں اپنی شکل
یہ کوئی واہمہ، یہ کوئی خواب تو نہیں

دیباچہ خلیق انجم کا تھا، جس میں انھوں نے لکھا:

''شہریار کے لب و لہجے پر زندگی کی ناہمواریوں، ناکامیوں اور یاسیت کی تلخی اور درشتی کی گہری پرچھائیاں ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ بھی اس لب و لہجے میں شامل ہے، جس کی وجہ سے تلخی میں شدت پیدا ہوگئی ہے، لیکن یہ تلخی ان حدود کو پار نہیں کرتی جہاں فنکار پر قنوطی یا یاسیت پسند ہونے کا الزام عاید ہوتا ہے۔ شہریار اپنے دھیمے اور گنگناتے لب و لہجے، آواز کی جرات مندی اور مستقبل پر بھرپور اعتماد کے اظہار سے اس تلخی کو ہمارے لیے گوارا بنا دیتے ہیں۔''

۱۹۷۴ سے ۱۹۸۱ تک Indian Council for Cultural Relations نے چار جلدوں میں ہندستان کی ۱۴ زبانوں کی موجودہ شاعری کے انتخاب کا انگریزی ترجمہ چھاپا۔ اردو شاعری کا انتخاب، جسے گوپی چند نارنگ نے کیا، چوتھی جلد میں شامل ہے۔ کتاب میں شہریار کی چھ نظموں کا ترجمہ بھی ہے اور نارنگ صاحب کا جدید شاعری پر ایک مبسوط مقالہ بھی۔ اس مقالے کے ایک اقتباس کا اردو ترجمہ نیچے درج ہے۔

''شہریار کو اس کی فکر نہیں ہے کہ ان کے شعر میں پیغام یا فیصلے ہوں۔ وہ اس روحانی کرب اور نفسیاتی کش مکش کا اظہار کرتے ہیں جس سے آج کا زخمی آدمی دوچار ہے۔ ہم وقت اور موت کی بے رحم حقیقتوں کے درمیان معلق ہونے کے باوجود حال کے لمحے میں جینے پر مجبور ہیں۔ شہریار سکھ اور دکھ کے مختصر لمحوں میں زندگی کے اصلی چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

شہریار کی کم بیانی پر مستزاد ان کی کم سخنی ہے، غالباً جس کے نتیجے میں ان کی مختصر نظمیں وجود میں آئی ہوں گی۔ اردو میں مختصر نظموں کو رائج کرنے والے اخترالایمان تھے۔ ان کی مختصر نظمیں چٹکلوں کی حیثیت سے تو بہت کامیاب رہیں، مگر بڑی نظمیں نہ بن سکیں۔ انھیں شاعر نے بقول خود 'چلتے پھرتے' لکھا تھا۔ اس کے برعکس منیر نیازی اور شہریار کی بہت سی مختصر نظموں کا شمار اردو کی بڑی نظموں میں کیا جاسکتا ہے۔ مجھے اخترالایمان کی مختصر نظمیں ایسی لگتی ہیں جسے مصوری یا معماری کی اصطلاح میں فارسی میں 'بے رنگ' کہتے ہیں، یعنی وہ خاکہ جو مصور یا معمار، تصویر یا عمارت، بنانے سے پہلے کھینچتا ہے۔

اخترالایمان کی مختصر نظموں کے برعکس، شہریار اور منیر نیازی کی مختصر نظمیں مجھے ان جدید مصوروں کی یاد دلاتی ہیں جو کسی ایک منظر کو مختصر کرنے کے لیے سو جتن کرتے ہیں۔ ایک مثال مشہور امریکی مصور بارنیٹ نیومن (Barnett Newman, 1905-1970) کی ایک پینٹنگ کی ہے جس کا عنوان ہے Voice of Fire۔ یہ ۸ فٹ چوڑی اور کوئی ۱۸ فٹ اونچی پینٹنگ صرف تین سیدھی لمبی پٹیوں پر مبنی ہے، جن میں سے بیچ کی پٹی سرخ ہے اور باقی دو پٹیاں نیلی۔ ۱۹۹۰ میں جب کینیڈا کی نیشنل گیلری نے اس پینٹنگ کو کوئی دو کروڑ ڈالر میں خریدا تو عوام اور پارلیمنٹ میں بڑی لے دے ہوئی تھی، مگر آرٹ کے واقف کاروں نے اس پینٹنگ کی بہت تعریف کی یہ کہہ کر کہ تین رنگین پٹیاں تو بچہ بھی بنا سکتا مگر جب ایک بڑا آرٹسٹ یہی عمل کرے اور اس کا عنوان بھی مقرر کردے تو اس کی ایمانداری میں شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ شارحین نے کہا کہ 'آگ کی آواز' کا اشارہ عبرانی اور نصرانی صحیفوں کے اس واقعہ سے ماخوذ ہے، جس میں رب کے حکم سے حضرت موسیٰ نے جب اپنا عصا بحر قلزم کی طرف بڑھایا تو سمندر کے پانیوں کے بیچ فصل ہوگئی اور ایک خشک راستہ بن گیا کہ بنی اسرائیل پار جاسکیں۔ جب فرعون اور اس کی فوجوں نے پیچھا کرنا چاہا، تو رب نے 'آگ اور بادل کے اونچے ستون' سے حضرت موسیٰ کو پھر حکم دیا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر پھیلائیں۔ فوراً سمندر کے پانیوں نے فرعون اور اس کی فوج کو غرق کردیا۔ ان شارحین کا کہنا ہے کہ نیلی پٹیاں فصل کیے گئے پانیوں کی علامت ہیں، اور سرخ پٹی فرعون اور اس کی فوج، یعنی برائی، کی موت کی۔

خدا جانے نیومین کا منشا کیا تھا، مگر اس پر دانشور متفق ہیں کہ یہ پینٹنگ مذاق نہیں ہے، کسی بڑے منظر کا مختصر ترین مرقع ہے۔ یہ پینٹنگ اب بھی کینیڈا کی نیشنل آرٹ گیلری میں ایک ممتاز مقام پر لگی ہوئی ہے اور اس کے سامنے ہمیشہ ایک چھوٹی موٹی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

شہریار کی بظاہر سادہ مختصر نظموں کے پیچھے بھی بہت اکتساب رہا ہوگا۔ مثال کے طور پر ان کی نظم 'میرا تو ارادہ تھا' دیکھیے:

میرا تو ارادہ تھا
ہونٹ سیڑھیوں سے میں
آسمان تک جاؤں
تو نے اس جگہ مجھ کو
اتنی دیر تک روکا
یہ بھی بھول بیٹھا میں
میرا کیا ارادہ تھا
اس وجود خاکی میں
جسم کچھ زیادہ تھا

ظاہر ہے، اتنی بڑی نظم 'چلتے پھرتے' نہ لکھی گئی ہوگی۔ اس نظم میں جنسی اشارے خاص توجہ چاہتے ہیں۔ ویسے جنسی اشارے شہریار کی شاعری میں اکثر ملتے ہیں مگر اس لطف سے کہ عامیانہ نہیں ہو پاتے مثلاً نیچے لکھے ہوئے شعر کے سامنے کے مضمون کو اگر کوئی معمولی شاعر نظم کرتا تو عجب نہ تھا کہ اس شعر کا شمار فحش لٹریچر میں ہوتا۔

ہونٹوں سے آگے کا سفر بہتر ہے ملتوی کریں
وہ بھی ہے کچھ نڈھال سا میں بھی ہوں کچھ تھکا ہوا

اسی ضمن میں شہریار کی ایک اور اچھی مثال ہے:

مرے ہونٹوں نے
جسم پر تیرے، بہت دیر تلک
حرف ناگفتی تحریر کیا

شہریار کی دوستیاں تو ہمیشہ کی ہوتیں مگر اختلاف کو بھول جاتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں انھوں نے شعروحکمت کے اداریہ میں لکھا کہ ''پچھلے دس سال ہمارے ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم ادب کے فنی یا کھلے لفظوں میں ادب کے غیر مقصدی اور غیر افادی پہلو پر زور دیتے رہے ہیں۔ ہمارا یہ انداز نظر ایک غیر ادبی صورت حال کا ناگزیر ردّعمل تھا، اور ردّعمل کسی نہ کسی صورت میں انتہا پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔'' سردار جعفری سمجھ گئے کہ 'غیر ادبی صورت حال' کا اشارہ ترقی پسند تحریک کی طرف تھا۔ انھوں نے اپنے رسالے 'گفتگو' میں شہریار اور 'ان کے قبیلے' کے شاعروں اور ادیبوں کے خلاف بہت سخت الفاظ میں ایک اداریہ لکھا۔ یہ بھی لکھا کہ ''میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ شہریار کے دل میں ایک اچھا شاعر خوابیدہ ہے۔ غیر مقصدیت اسے بیدار نہیں ہونے دیتی۔'' ان الفاظ کے بعد، شہریار کے دل میں سردار جعفری کے خلاف ہمیشہ کے لیے کدورت بیٹھ جانی چاہیے تھی، مگر شاید بہت لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ شہریار اس گیان پیٹھ انعام کی جیوری میں تھے جس نے سردار جعفری کو یہ گراں قدر انعام دیا۔ نہ صرف یہ کہ شہریار اس جیوری کے ممبر تھے بلکہ یہ بھی کہ جعفری صاحب کا نام بھی انھوں نے ہی تجویز کیا تھا اس بنا پر کہ ان کے خیال میں ''سردار جعفری ہی اس وقت ایک ایسے ادیب اور شاعر تھے جن کو یہ ایوارڈ مل سکتا ہے۔''

شہریار نظری اختلافات کو رشتوں میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ جذبی کی وفات سے کچھ مہینے پہلے، مجھے ان سے ملانے لے گئے۔ وہ شہریار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ باتوں باتوں میں اختر الایمان کا ذکر آیا تو جذبی صاحب نے ان کی شاعری کا ذکر کچھ اہانت سے کیا۔ شہریار نے کہا، ''جذبی صاحب آپ بہت متعصب آدمی ہیں۔'' پھر باتیں ایسے ہی ہوتی رہیں جیسے کوئی اختلاف ہوا ہی نہ ہو۔

میرے سامنے جذبی صاحب نے فرمائش کی: ''کنور صاحب، نئی غزل سنائیے۔'' شہریار نے غزل سنائی۔ ایک شعر تھا:

تو پھر بتاؤ سمندر صدا کو کیوں سنتے
ہماری پیاس کا رشتہ تھا جب سراب کے ساتھ

جذبی صاحب نے ٹوکا، پہلے مصرعے کو ایسے کہیے:

تو پھر بتاؤ سمندر ہماری کیوں سنتے

انھوں نے غور نہیں کیا کہ سمندر۔ صدا کا مرکب سمندر کی صدا کے لیے تھا۔ شہریار نے سنی ان سنی کر دی۔

۱۹۸۳ میں علی گڑھ یونیورسٹی نے شہریار کو لکچرار سے ریڈر بنا دیا۔ اب تک ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی، بالترتیب ہمایوں، فریدوں اور سائمہ، ہو چکے تھے۔ نجمہ شہریار گرلز کالج میں انگریزی کی لکچرار ہو گئی تھیں۔ شہریار اور ان کا کنبہ یونیورسٹی کے مکان میں آرام سے رہ رہا تھا۔ بظاہر ازدواجی زندگی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی، مگر نادیدہ رخنے پڑنے لگے تھے، جس کی ایک وجہ تو شہریار کی شراب اور تاش کی لت تھی اور دوسری نجمہ شہریار کا تیکھا اور ذرا شکّی مزاج بھی تھا۔ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے ۱۹۸۰ میں لکھے ہوئے شہریار کے خاکے میں دلّی کی ایک شام کا ذکر کیا جب انھوں نے اور شہریار نے ایک شام ایک مغنیہ کا گانا سننے میں گزاری۔ چلتے وقت شہریار نے مجتبیٰ حسین سے درخواست کی اس شام کا ذکر نجمہ سے نہ کریں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا کہ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں اور آئندہ بھی قائم رہوں گا! شاید شہریار کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کی بیوی ان پر بہت بھروسا نہیں کرتیں۔ ۱۹۸۰ کے قریب منیب الرحمٰن جب امریکہ سے علی گڑھ گئے تو ایک شام شہریار کے گھر بھی گئے تو نجمہ نے بتایا کہ وہ دو روز سے گھر نہیں آئے کہ کلب میں تاش کھیل رہے تھے۔

۱۹۸۵ میں شہریار کا چوتھا شعری مجموعہ 'خواب کا در بند ہے' آل احمد سرور کے مختصر تبصرے کے ساتھ شائع ہوا۔ سرور صاحب نے لکھا کہ "شہریار برابر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور اردو شاعری کو ان سے ابھی بہت کچھ توقعات ہیں۔ خدا کرے کہ وہ تکرار اور تکان سے محفوظ رہیں۔" اس مجموعے پر انھیں ۱۹۸۷ میں ساہتیہ اکادمی نے اپنے معتبر انعام سے نوازا۔ اس کتاب کا انتساب وجے کمار بجاج اور 'پہلے عشق' کے نام تھا۔ گمان غالب ہے کہ پہلا عشق 'ان آنکھوں کی مستی' کی غزل والی ملکہ، جہانِ حسن و عشق بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے کتاب کا کاپی رائٹ نجمہ کے نام تھا، اور کتاب کے آخر میں شاعر نے اپنی بیوی کا شکریہ ان الفاظ میں

ادا کیا: ''اپنی بیوی نجمہ شہریار کا (شکریہ) جو اس مجموعے میں شامل اکثر چیزوں کی پہلی سامع ہیں۔'' ساہتیہ اکادمی کی دعوت پر میں نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کنیڈین شاعرہ لیزلی لاوین کے ساتھ کیا۔ ترجمے کی یہ کتاب ۱۹۹۰ میں چھپی، جس کے ایک آدھ سال بعد میں پہلی دفعہ شہریار سے ممبئی میں اختر الایمان کے گھر ملا۔ مجھے یاد ہے اس روز شہریار نے ذرا زیادہ ہی پی لی تھی۔ جب ان کے جانے کا وقت آیا تو اختر الایمان نے مجھ سے کہا کہ میں شہریار کو ٹیکسی میں بٹھا دوں۔ اس دن ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دوست بنا لیا، اور یہ رشتہ اب بھی قائم ہے۔ بالمشافہ ملاقات تو گاہے ماہے ہی ہوتی ہے، مگر فون پر گپیں اور غیبتیں اکثر ہو جاتی ہیں۔

۱۹۸۷ میں یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر کا عہدہ دیا۔ یہ بات ذرا حیرت انگیز ہے اس لیے کہ عام طور پر علی گڑھ جیسی اہم یونیورسٹیوں میں لٹریچر کے استادوں کو پوری پروفیسری تنقید کی دو چار کتابیں لکھنے کے بعد ہی ملتی ہے۔ شہریار کہتے ہیں وہ صرف اپنی شاعری کی وجہ سے پروفیسر بنے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی دوسری ادبی خدمات کے تخمینے میں بخل سے کام لے رہے ہیں۔ انھوں نے ادبی مضامین بھی لکھے ہیں، ترجمے بھی کیے ہیں، کتابیں بھی مرتب کی ہیں اور اپنی تمام ادبی زندگی میں ادبی رسالوں کی ادارت بھی کی ہے۔ مدّت ہوئی مغنی تبسم کے ساتھ انھوں نے شعر و حکمت کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ، جو اب بھی نکل رہا ہے، اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

ہائی اسکول کرنے کے بعد ہماری بیٹی، نتاشا، ایک سال کے لیے علی گڑھ پڑھنے گئی۔ کسی وجہ سے اس کے داخلے کے کاغذات وقت پر داخل دفتر نہ ہو سکے۔ نتاشا کو داخلہ دلانے میں جو تگ ودو شہریار نے کی، وہ صرف ایک مخلص دوست ہی کر سکتا ہے۔ نجمہ شہریار، نتاشا کی جماعت کو انگریزی پڑھاتی تھیں، مگر طالب علموں میں اپنی تلوّن مزاجی کی وجہ سے بہت مقبول نہ تھیں۔

۱۹۹۵ تک شہریار اور نجمہ شہریار کی ازدواجی زندگی کے نادیدہ رخنے ایک ناقابل عبور خلیج بن گئے۔ اس سال نجمہ نے خلع مانگا اور ۲۷ سال کی عمر کی پریوں کی داستان والی

شادی ایک ناگوار خواب بن گئی۔ اب نجمہ شہریار پھر سے نجمہ محمود ہو گئی ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ شادی بھی نجمہ کی پیش قدمی سے ہوئی تھی اور غمی بھی ان کے ایما پر۔ خلیل الرحمن اعظمی کی وفات اور نجمہ سے طلاق غالباً شہریار کی زندگی کے سب سے بڑے المیے تھے۔ ایک نظم 'مغنی تبسم کے نام' میں انھوں نے اپنے المیوں کا ذکر کیا ہے:

اے عزیز از جان مغنی
تیری پرچھائی ہوں لیکن کتنا اتراتا ہوں میں
اعظمی کا مرنا نجمہ کا بچھڑنا
تیرے بل بوتے پہ سب کچھ سہہ گیا

اب بھی کسی حیلے نجمہ کا ذکر نکل آئے تو شہریار کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔

شہریار مشاعروں میں پڑھتے ہیں مگر ایسی بے دلی سے کہ لگتا ہے کہ بیگار ٹال رہے ہوں اور اکثر شعر بھی ایسے پڑھتے ہیں جو سامع پر فوراً منکشف نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود مشاعروں میں ان کی بڑی مانگ ہے۔ میرا خیال ہے کہ مشاعروں میں شہریار کی مقبولیت کی بنیادی وجہ ادب میں ان کا رتبہ ہے جو اردو ادبی حلقوں کے باہر بھی پہچانا جاتا ہے۔ ان کے سب شعری مجموعے دیوناگری لپی میں، بغیر مشکل الفاظ کی تشریح کے، اردو مجموعوں سے بہت زیادہ تعداد میں چھپ چکے ہیں۔

شہریار کی مقبولیت میں تھوڑا بہت ہاتھ ان کے دو چار فلموں کے گانوں کا بھی ہے۔ ان کے مداح مظفر علی نے ایک فلم 'گمن' بنائی جس میں ان کی 'اسم اعظم' کی دو غزلیں گانوں کے طور لی گئیں:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

میں اس فلم کے بارے میں تو زیادہ نہیں جانتا مگر دوست بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں اس کے 'گانے' خواص وعوام کو ازبر ہو گئے تھے۔ مظفر علی کی ایک اور فلم، امراؤ جان، میں سارے گانے شہریار کے تھے، جن کی مقبولیت کوئی دو دہائیوں کے بعد بھی کم نہیں ہوئی۔ دو ایک سال پہلے منیب الرحمٰن نے کراچی میں فلم امراؤ جان کے گانے سن کر شہریار کو ایک نظم 'امراؤ جان ادا کراچی میں' لکھ کر خراج عقیدت دیا تھا۔ آپ بھی پڑھیے۔

مٹھائیوں کی دکاں پہ جو ٹیپ بجتا تھا
سنا جو میں نے تو گانے تھے آشنا مجھ کو
وہ لطفِ شعر، وہ خاطر نواز موسیقی
لبھا رہی تھی بدستور ہر صدا مجھ کو
مہک اٹھی تھی فضا صبح دم کراچی کی
دیارِ ہند سے آئی تھی یہ ہوا مجھ کو
نظر کے سامنے پھر لکھنؤ کی گلیاں تھیں
کسی کی بزمِ طرب کا گماں ہوا مجھ کو
ملال تھا انہیں پیچھے ہی چھوڑ آیا ہوں
کہ آج مل گئیں امراؤ جان ادا مجھ کو

فلم 'انجمن' کے گانے بھی شہریار نے لکھے تھے، اس کا ایک دوگانا مجھے بہت پسند ہے جس میں ایک دلنشیں آواز شبانہ اعظمی کی ہے، جو کسی ایسی الھڑ لڑکی کی لگتی ہے جو سریلی تو بیحد ہو مگر جس کی آواز ریاض سے پختہ نہ ہوئی ہو۔

گلاب جسم کا یونہی نہیں کھلا ہوگا
ہوا نے پہلے تجھے، پھر مجھے چھوا ہوگا

شبانہ کی سحر انگیز آواز اس شعر کے معنی کو مجسم کر دیتی ہے:

شریر شوخ کرن مجھ کو چوم لیتی ہے
ضرور اس میں اشارہ ترا چھپا ہوگا

اس فلم کا ایک اور خوبصورت گیت شبانہ نے گایا ہے:

تجھ سے ہوتی بھی تو کیا ہوتی شکایت مجھ کو
تیرے ملنے سے ملی درد کی دولت مجھ کو

سنا ہے کہ 'انجمن' کبھی ریلیز نہیں ہوئی۔ میں حیران اس بات پر ہوں کہ یہ گانے مقبولِ عام کیوں نہ ہوئے اور اس بات پر بھی کہ شہریار نے انھیں اپنے شعری اثاثے میں شامل کیوں نہ کیا۔

۱۹۹۵ میں شہریار کا پانچواں شعری مجموعہ 'نیند کی کرچیں' کے نام سے چھپا۔ اس میں دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔ میرے خیال میں شہریار کی شاعری کو پوری طرح سمجھنے کے لیے، فاروقی صاحب کا یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے اور دوسرا ان کا وہ مضمون بھی جو 'سکوتِ سنگ اور صدائے درد' کے عنوان سے شعر و حکمت کے دورِ سوم کی پانچویں کتاب (جنوری ۲۰۰۳) کے گوشۂ شہریار میں ہے۔

'نیند کی کرچیں' وجے کمار بجاج اور شہریار کے دوسرے بیٹے فریدوں شہریار کے نام معنون ہے۔ کاپی رائٹ ہمایوں شہریار اور سائمہ شہریار کے نام ہے۔

یونیورسٹی سے ۱۹۹۶ میں رٹائر ہونے کے بعد شہریار کے کئی شعری مجموعے اردو اور دیوناگری لپی میں منظرِ عام پر آئے، ان کتابوں کی تفصیل نیچے درج ہے۔

میرے حصے کی زمین (دیوناگری میں کلیات)، ۱۹۹۸، امتیاز احمد کا دیباچہ، انتساب گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور مغنی تبسم کے نام

میرے حصے کی زمیں، حصہ اول (غزلوں کا کلیات)، ۱۹۹۹، ابوالکلام قاسمی کا دیباچہ، انتساب وجے کمار بجاج کے نام

حاصلِ سیرِ جہاں (کلیات)، ۲۰۰۱، خود اپنا آدھے صفحے کا دیباچہ، انتساب وجے کمار بجاج کے نام

دھند کی روشنی، (انتخاب)، ۲۰۰۳، خود اپنا دو صفحے کا دیباچہ، انتساب کسی کے نام نہیں

شام ہونے والی ہے (نیا مجموعہ)، ۲۰۰۴، خود اپنا ایک صفحے کا دیباچہ،
انتساب وجے کمار بجاج کے نام
میں وجے کمار بجاج سے کبھی نہیں ملا، مگر ملنے کی خواہش ضرور ہے کہ دیکھیں تو سہی کون 'معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں' کہ جس کے نام اتنی کتابیں منسوب ہوئی ہیں۔

۱۹۷۲ میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے، عنیب الرحمٰن اور وحید اختر کے تعاون سے، 'نئی نظم کا سفر' کے نام سے جدید نظم کا ایک بے لاگ انتخاب شائع کیا۔ اس میں شہریار کی یہ نظمیں شامل ہیں: نیا امرت، اپنی یاد میں، دانۂ گندم سے دوری۔ پہلی نظم 'اسم اعظم' سے ہے اور دوسری نظمیں 'ساتواں در' سے۔

گوپی چند نارنگ کے انتخاب (۱۹۸۱) میں شہریار کی ان نظموں کے تراجم ہیں: ایک لمحے سے دوسرے لمحے تک (اسم اعظم)، فریب در فریب (اسم اعظم)، اسٹل لائف (ساتواں در)، نیا عذاب نیا دن (اسم اعظم)، دھندلکا (اسم اعظم) اور رات، دن اور پھر رات (ساتواں در)۔

شہریار کی نظموں کے ایک اچھے انتخاب کا قابل قدر انگریزی ترجمہ رخشندہ جلیل نے کیا ہے۔ کتابی شکل میں یہ انتخاب، Through the Closed Doorway کے نام سے، ۲۰۰۴ میں چھپا۔

اسی سال، ۲۰۱۰ میں، ساہتیہ اکادمی نے شہریار کے منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ Selected poetry of Shahryar کے عنوان سے چھاپا۔ انتخاب میرا ہے اور ترجمہ میں نے مری این ائرکی کی مدد سے کیا ہے۔

شہریار آج کل علی گڑھ یونیورسٹی کے قریب ایک کئی منزلہ عمارت کے ایک چھوٹے سے مگر آرام دہ فلیٹ میں رہتے ہیں۔ روز شام کو سات بجے سے گیارہ بارہ بجے رات تک علی گڑھ شہر کے ایک کلب میں رمی ضرور کھیلتے ہیں۔ شراب پینا چھوڑ دیا ہے کہ 'اب اس میں لطف نہیں آتا'۔ دوستوں سے رابطہ رکھنے کے لیے موبائل فون ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں۔ فرصت کے باوجود شعر کہنے کی رفتار وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ مشاعرے خوب پڑھتے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اب بے دلی سے نہیں پڑھتے۔

شہریار نے 'دھند کی روشنی' کے دیباچے میں پڑھنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ "چالیس سال سے زیادہ عرصے پر پھیلی ہوئی اس شاعری کو صرف آج کی شاعری سمجھ کر نہ پڑھیے، یہ شاعری بہت سے گزرے ہوئے کلوں سے اٹوٹ رشتہ بھی رکھتی ہے۔"
معین احسن جذبی کی، ۱۹۴۱ میں لکھی ہوئی مشہورِ زمانہ چھ بند کی نظم 'موت' کا پہلا بند ہر اردو شعر سے دلچسپی رکھنے والے شخص کو یاد ہوگا:

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جذبی کی نظم سے اگر ایک آدھ بند نکال بھی دیا جائے تو نظم کے اثر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شہریار نے جذبی کے مضمون کو 'موت' کے عنوان ہی سے اس طرح نظم کیا ہے:

ابھی نہیں ابھی زنجیرِ خواب برہم ہے
ابھی نہیں ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں ابھی در باز ہے امیدوں کا
ابھی نہیں ابھی سینے کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں ابھی کم بخت دل دھڑکتا ہے

یہ خوبصورت نظم شہریار کے پہلے مجموعے 'اسمِ اعظم' کی ہے، گویا ۱۹۶۵ سے پہلے کی لکھی ہوئی۔ داد دینی چاہیے کہ انھوں نے آج کا چراغ کل کے چراغ سے خوب روشن کیا ہے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے کم لوگ ہی اس بات سے اختلاف کریں گے کہ شہریار کی مختصر نظم میں سے کوئی مصرع نظم کا اثر زائل کیے بغیر خارج نہیں کیا جا سکتا۔

شہریار کی شاعری میں نیند کے آنکھوں سے روٹھے رہنا کا استعارہ بار بار آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خود سونا کم چاہتے ہیں کہ زندگی کا لطف کھلی آنکھوں سے لے سکیں۔ خدا جانے

ان استعاروں کی حقیقت کیا ہے، مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ ان کے فون جب آتے ہیں تو ہندستان میں یا تو علی الصباح ہوتی یا گہری رات۔ وقت جو بھی ہو ان سے بات کر کے طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ان کے شعر تو مدت سے میرے دمساز ہیں۔ ان کی غزلوں کے بہت سے شعر مجھے ازبر ہیں، جن میں سے کچھ بغیر کسی ترتیب نے نیچے لکھتا ہوں۔

بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

راتوں کو جاگنے کے سوا اور کیا کیا
آنکھیں اگر ملیں تھیں کوئی خواب دیکھتے

پہلے نہائی اوس میں پھر آنسوؤں میں رات
یوں بوند بوند اتری ہمارے گھروں میں رات

گزرے تھے حسین ابن علی رات ادھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آ گیا

مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو مری وحشت کا سبب
بوئے آوارہ سے پوچھو کہ بھٹکتی کیوں ہے

تیرا کیا تو تو برس کر کھل گیا
میرا سب کچھ بہہ گیا سیلاب میں

شکوہ کوئی دریا کی روانی سے نہیں ہے
رشتہ ہی مری پیاس کا پانی سے نہیں ہے

اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں
حاصلِ سیر جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

زمین کو بھی یہیں آ کے ختم ہونا تھا
سفر ارادہ بہت دور کا ابھی تک تھا

حال ترے ماضی پر مجھ کو کتنا رشک آیا
کل جو اچانک ملنا ہوا اک یاد پرانی سے

شہریار کا ۲۰۰۱ تک کا مکمل کلام علی گڑھ سے 'حاصلِ سیر جہاں' کے نام سے چھپا تھا۔ یہ نام اوپر لکھے ہوئے شعر سے ماخوذ ہے۔ جو مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کا نام، سورج کو نکلتا دیکھوں، شہریار نے اپنے اس شعر سے لیا ہے:

ایک ہی دھن ہے کہ اس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو نکلتا دیکھوں

'حاصلِ سیر جہاں' تو اب بازار میں ملتا نہیں، مجھے یقین ہے کہ شہریار کے اس مکمل کلام کی خوب پذیرائی ہوگی۔

بیدار بخت، ٹورونٹو

۲۸ جولائی، ۲۰۱۰

سورج کو نکلتا دیکھوں

سرور الہدیٰ

کلیات شہریار 2008 میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا، جس میں ان کے پانچ شعری مجموعے شامل ہیں۔ سنگِ میل نے جس اہتمام سے کلیات شہریار شائع کیا اس سے شہریار انتہائی خوش تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں بھی یہ کلیات اسی خوبصورتی کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ کلیات شہریار کا متن بیدار بخت نے تیار کیا تھا انھوں نے یہ متن مجھے بھیج دیا۔ شہریار صاحب نے مجھے حکم دیا کہ سرور اس کام کو تم دیکھ لو شاید اس لیے بھی کہ میں ہمہ وقت ان کے لیے دہلی میں حاضر تھا۔ کلیات شہریار کے پاکستانی ایڈیشن میں کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں ان کی جانب شہریار صاحب نے اشارہ کر دیا تھا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں متن دیکھنا شروع کیا۔ ایک ملاقات میں ان سے درخواست کی کہ آپ خود بھی اسے دیکھ لیں۔ کوئی دو سو صفحات میں نے ان کے حوالے کیے جب بھی ان سے بات ہوتی تو ان صفحات کے تعلق سے پوچھتا اور ایک ہی جواب ملتا کہ میں دیکھ لوں گا۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ان کی طبیعت خراب ہوتی گئی اور ایک وقت آیا کہ مجھے فون پر کہا کہ سرور تم دیکھ لو، میرے لیے دیکھنا ممکن نہیں۔ ان کا آخری مجموعۂ کلام ''شام ہونے والی ہے'' اگست 2004 میں شائع ہوا تھا۔ ''شام ہونے والی ہے'' کے ''حرف آغاز'' میں انھوں نے لکھا تھا:

''میرا یہ چھٹا مجموعہ ہے اس میں زیادہ تر وہ شاعری ہے جو میں نے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد کی۔ ملازمت کے دوران میں نے کمیت کے اعتبار سے زیادہ شاعری کی۔ شعر کہنے کی رفتار کے ست ہونے کا سبب میری سمجھ میں نہیں آتا اس لیے اس مسئلے پر گفتگو کسی اور وقت کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں۔''

شہریار کا جو کلام ''شام ہونے والی ہے'' کے بعد کا ہے اسے باقیات کے نام سے کلیات کے آخر میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اس دوران ان کا زیادہ تر کلام کتاب نما دہلی میں شائع ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ فون پر مجھے اپنا کلام لکھواتے تھے، جسے میں کتاب نما کے سپرد کردیتا تھا۔ کلیات کا نام ''سورج کو نکلتا دیکھوں'' شہریار صاحب نے خود ہی تجویز کیا تھا جو اُن کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

ایک ہی دھن ہے کہ اس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو نکلتا دیکھوں

کتاب کا سرورق شہریار صاحب نے دیکھ لیا تھا۔ جو صفحات میں نے شہریار صاحب کو دیکھنے کے لیے دیے تھے، وہ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کی توجہ سے مجھے مل گئے۔ اس کلیات کے لیے شہریار صاحب نے کوئی علیحدہ دیباچہ نہیں لکھا بلکہ کلیات کے پاکستانی ایڈیشن کے دیباچے ہی پر کچھ اضافہ کردیا ہے۔ میں شہریار صاحب کے دونوں فرزندان ہمایوں شہریار اور فریدون شہریار کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کام کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون پیش کیا۔ اس کلیات کا سرورق فرحان مجیب صاحب نے بنایا ہے اور اس پر جو شہریار صاحب کی تصویر ہے وہ صدیق احمد صدیقی صاحب کی کھینچی ہوئی ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے شہریار صاحب کے اس مسودے کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

○○○

اسمِ اعظم

(۱۹۶۵)

خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام

"عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں"

تبصرہ

شہریار کی نظموں اور غزلوں میں پہلی خوبی جو مجھے نظر آئی وہ یہ کہ یہ طول کلامی کے عیب سے پاک ہیں۔ ان مختصر احساس سے تھرتھراتی ہوئی اور جذبے سے بھرپور نظموں اور غزلوں میں دوسری خوبی یہ ہے کہ ان میں جدید نسل کے اس مجروح ذہن کے نقوش ہیں جو خوابوں اور حقیقتوں کے تصادم میں پس کر رہ گیا ہے۔ اس نسل کو رجائی یا قنوطی کہنا درست نہ ہوگا، یہ آدرشوں کی ماری ہوئی ہے اور اسی لیے اس کا غم دوسری نسلوں کے غم سے مختلف ہے اور اسی لیے اس کا عرفان ضروری ہے۔ ان نظموں میں جو احساس کی تتلی کے پیچھے دوڑنے کی کوشش ہے وہ انھیں معنویت عطا کرتی ہے۔ ان کا اسلوب ایک انفرادیت رکھتا ہے جو قابل توجہ ہے۔ غزلوں میں ایک نئے تغزل کی لے فوراً ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ مشاعروں کی طرحوں کی غزلیں نہیں ہیں، روح کے ساز پر بجنے والے گیت ہیں۔ غزلوں میں جو مدھم آنچ ہے وہ گہرے جذبے کی تہذیب سے آئی ہے اور اسی لیے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس ذوقِ جستجو کو نئے دشت وصحرا ملیں گے اور اس کی مناسب قدر ہوگی۔

آل احمد سرور

تبصرہ

گذشتہ دس سال میں جو شعرا منظر عام پر آئے ہیں ان میں شہریار کو ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ ان کا کلام چھوٹے چھوٹے تاثرات کا مجموعہ ہے۔ ایسے تاثرات جو بظاہر سادہ و مانوس ہوتے ہوئے اپنے اندر فلسفیانہ سچائی رکھتے ہیں۔ ان کی نیم خوابی کیفیت قاری کو تجسس پر اکساتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے گویا غروب کے وقت ماحول کی ہر چیز کچھ سے کچھ ہوگئی ہو اور دیکھنے والا اپنے آپ سے باتیں کرتا چلا جا رہا ہو۔

منیب الرحمٰن

تعارف

لوگ کہتے ہیں کہ اگلے زمانوں میں ایک اسم ایسا تھا، جس کا جاننے والا حیات و کائنات کی تمام طاقتوں پر فتح پالیا کرتا تھا، اور اس کی ہر مراد بر آتی تھی، اب نہ وہ زمانے رہے نہ ایسے لوگ جو کسی ایسے ''اسم اعظم'' کے متلاشی ہوں۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ انسان اپنی بساط بھر کوشش کر رہا ہے کہ طلسماتِ کائنات کا راز معلوم کرے اور اس پر قابو پائے، اس طلسم کا دائرہ نظامِ شمسی سے بھی پرے، ستاروں سے آگے جو اور جہاں ہیں، وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ مکان کے فاصلے تو اسیر ہو ہی رہے ہیں، زمان کے گمشدہ سروں کو بھی ڈھونڈ ا اور پایا جا رہا ہے، زمین کی طنابیں کھنچ چکی ہیں، اور مشرق و مغرب کی حدیں چشم زدن میں ایک دوسرے سے آملتی ہیں۔ اس تسخیر میں انسانی ذہن نے وہ معجزے کر دکھائے ہیں، جو آج سے پہلے ممکن نہ تھے۔ مگر خود انسان، اس کی ذات، اس کا ذہن اور اس کی تہہ در تہہ وسعتیں ایسا عالمِ طلسمات ہیں جس کی تسخیر کے لیے کوئی ''اسم اعظم'' دریافت نہیں ہو سکا، اس دنیا کی سیر آج بھی صرف ادب و شعر اور بعض دوسرے فنونِ لطیفہ کے وسیلے سے ہی ممکن ہے، سائنس عقل کی گتھیاں تو سلجھا سکتی ہے مگر ذہن کی سطح کے نیچے جو بھی طوفان اٹھتے ہیں، جو عوامل و محرکات کام کرتے ہیں اُن کا اندازہ صرف ادب و شعر سے ہی ہو سکتا ہے، یہی ایک ایسا وسیلہ ہے جو انفرادی سطح پر بھی، اور اجتماعی سطح پر بھی انسان اور اس کے ذہن کو سمجھنے میں آئینے کا کام دیتا ہے، شاید اپنے آپ کو پانے اور معلوم کرنے کی یہی کوشش ادب کو سائنس کے مقابلے میں بھی زندہ رکھے گی، شہریار کے ''اسم اعظم'' کا خلاصہ بھی یہی کوشش ہے، وہ بھی انسان اور

اس کی ذات کو جس کا علم وعرفان بجائے خود اسمِ اعظم ہے، اپنے ذہن اور تجربات کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس آئینے میں آپ کو ان کی صورت بھی نظر آئے گی، اور اپنی بھی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد انسانوں کی جس نسل نے ہوش کی آنکھیں کھول کر اپنے آپ کو جاننے، سمجھنے اور اپنی ذات سے دوسروں کی ذات کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ذہنی سفر شروع کیا، اُسے قدم قدم پر ان اقدار کی لاشوں سے گزرنا پڑا جنھیں انسان نے صدیوں اپنے لہو سے پالا تھا، اور پھر اپنے ہی ہاتھوں شہید بھی کردیا تھا، اقدار ہی زخمی اور شہید نہیں ہوئیں، خود انسان اور اس کی ذات بھی بُری طرح گھائل ہوئی ہے اور آج تک زخموں سے خون رس رہا ہے، ان زخموں پر نظر ڈالیے تو زندگی، اس کے حُسن، اس کے اعلیٰ مقاصد پر سے بھی ایمان اٹھنے لگتا ہے اور انسان کی ذات پر سے بھی، اس دور نے زخم خوردہ اقدار کے زیر سایہ زخم خوردہ شخصیتیں پیدا کیں، جو شدید احساسِ تنہائی کا شکار ہیں، ہر روح کے ہاتھ میں اس کے اپنے زخموں کا اعمال نامہ ہے اور دار وگیر عرصۂ حشر میں نفسی نفسی کا وہ غل ہے کہ کوئی کسی کی جزا کو نہیں پہنچتا، سب ایک ہی غم کے اسیر ہیں، سب کے درمیان درد کا ایک ہی رشتہ ہے، پھر بھی سب کس قدر تنہا ہیں! جدید ادب اسی انفرادی اور اجتماعی احساسِ تنہائی کی داستان ہے، اردو میں آزادی کے چند برسوں کے بعد زندگی کے سانچے بدلے تو یہ نیا طرزِ احساس جو ہندستان گیر ہی نہیں عالم گیر ہے ذہنوں میں جگہ پانے لگا، بدلے ہوئے حالات نے ادب وفن کے سمجھنے، جانچنے، پرکھنے اور برتنے کا بھی ایک نیا شعور دیا، سیاسی اور سماجی مسائل اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ موجود رہے، مگر ان ہی کے درمیان سے اپنی ذات اور زخم خوردہ عالمِ انسانیت کے سمجھنے کے ایک نئے طرزِ فکر نے بھی سر اٹھانا شروع کیا، موضوعات کے انتخاب کا طریقہ بدلا تو زبان اور لہجے میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں، ان تمام تبدیلیوں کا اثر جتنے بھرپور طریقے سے ہماری جدید شاعری میں رونما ہوا، اتنا اور کسی صنف میں اس کا اظہار نہیں ہو پایا۔ شہریار اُن ہی شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اس صدی کی چھٹی دہائی میں آہستہ آہستہ اس نئے طرزِ احساس، طرزِ فکر، اندازِ بیان اور لہجے کو اپنانے کی کوشش کی، اور آٹھ دس برس کی مدت میں اُن کا شمار ایسے شاعروں میں ہونے لگا جنھیں

وقت کی آواز کہا جا سکتا ہے، ان کی آواز خود بھی چوٹ کھائے ہوئے ہے اسی لیے دوسرے دلوں پر چوٹ لگاتی ہے، وہ بھی اوروں کی طرح اپنے زخموں کی کتاب کھولے ہیں، مگر یہ زخم صرف ان کے نہیں، ان جیسے بہت سے نوجوان ذہنوں اور دلوں کے زخم ہیں، ان کا طرزِ فکر اور اندازِ بیان ہماری پُرانی شاعری کی روایتوں سے مختلف ہے، وہ ان شاعروں میں سے ہیں جن کے تجربوں کو شاید اب بھی بہت سے بزرگ ''بدعت'' سمجھتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادب و شعر کی شرع اس بدعت کے حق میں وقت کے صحیفے سے کئی جواز پیش کر سکتی ہے۔

اس وقت ہر ذہین اور حساس نوجوان جسے فطرت نے روشنیِ طبع کی بلا میں مبتلا کیا ہے، اپنے خوابوں کی دنیا کا بھٹکا ہوا مسافر ہے۔ وہ اپنے خواب کی دنیا میں چند ایسے بچے کھچے سپنوں کو آنکھوں سے لگائے گھوم رہا ہے، جنھیں اس نے دستبردِ حوادث سے بچا رکھا ہے، یہی خواب اس کی کمزوری بھی ہیں اور اس کی طاقت بھی، کمزوری یوں کہ وہ اسے حقائق سے سمجھوتہ نہیں کرنے دیتے، قوت یوں کہ وہ انھی کی روشنی میں ایک ایسی دنیا کی کھوج کر رہا ہے جہاں ان خوابوں کی آبرو محفوظ رہ سکے۔ شہریار کی پہلی نظم کا عنوان ہی ''خواب'' ہے۔ یہی خواب ان کی اور نظموں میں بھی کہیں ہلکا اور کہیں گہرا سایہ ڈالتا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہ خواب زخمی بھی ہیں، پامال بھی، توانا بھی ہے اور سرفراز بھی، یہ ایسے خواب ہیں جنھیں اپنی رہگذر پر مسلسل چلتے ہوئے بے کنار وقت جنم دے کر پیچھے چھوڑ گیا ہے اور یہ وقت کے ساتھ چلنے اور بھاگنے کی کوشش میں زخم کھا کھا کر ہانپ بھی رہے ہیں اور آنکھوں میں امید کی روشنی لیے وقت کو پالینے کے آرزومند بھی ہیں، زندگی انھی خوابوں کی لے پر رقص کرنے کا نام ہے:

خواب کی تال پر
نیند کی تھال پر
رات بھر رقص کر
شمعِ آشفتہ سر

اور اسی لیے شہریار کی نظر میں کائنات بھی ایک ایسا خواب ہے، جس کے لیے وہ کہتے ہیں:

بوجھو تو پاگل کا سپنا، سمجھو تو سنسار

اس خواب نگر میں وہ اکیلے نہیں، ان کا سفر اپنے ایسے دوسرے انسانوں کی تلاش میں جاری ہے:

مجھے اپنی اور اپنے جیسے
سیہ بخت انسانوں کی جستجو ہے

یہ آواز بھی، جو ہم سفروں کو اپنے ساتھ بلا رہی ہے، مشینوں کے شور، اور انسان انسان کے درمیان نفرت پیدا کرنے والے سیاسی نعروں کے جنگل میں گم ہوگئی ہے:

اندھیرے کا سر جو اُجالے کی تلوار سے کاٹتی تھی
سیہ بختوں کو روشنی بانٹتی تھی
جو تنہائی کی کھائی کو پاٹتی تھی
اس آواز کو بھی ہوا کھا گئی ہے
قیامت بہت ہی قریب آ گئی ہے

بعض گوشوں سے اردو کے جدید شاعروں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے خول میں اسیر ہیں، اور اپنے زمانے، اپنے ماحول اور خود زندگی سے بیزار ہیں۔ خود اس اعتراض کی بنیاد اپنے وقت کی آواز کو نہ سمجھنے، اور شاعری کے جدید تجربوں سے بیزاری پر قائم ہے، پھر بھی جو لوگ صدقِ نیت سے ایسا سمجھتے ہیں، میں اُن سے سفارش کروں گا کہ وہ اس مجموعے کی یہ نظمیں ضرور پڑھیں جن کے عنوان ہیں 'مستقبل'، 'موت'، 'پیغام'، 'عرفان'، 'سوال'، 'التجا'، 'قربِ قیامت'، 'ہم سفر و جرم و سزا'، 'پرچھائیاں'، 'انوکھی پیشکش' اور 'نیا کھیل' ان نظموں میں زندگی سے محبت کا احساس بھی ہے، انسانوں کے مسائل اور ان کی ذات سے آگہی بھی، اور ایک بہتر زندگی، بہتر سماج اور بہتر دنیا کی آرزو بھی۔ ہمارے پڑھنے والے پچھلے کئی برسوں تک اس بات کے عادی رہے ہیں کہ سیاسی اور سماجی مسائل پر ان سے شاعر براہِ راست بات کرے۔ اب شاعری میں براہِ راست بات کرنے اور سُننے کو پسند نہیں کیا جاتا کیونکہ ہم نے تجربے سے اتنا تو سیکھ ہی لیا کہ ادب اور صحافت، شاعری اور سیاسی نعرے میں فرق ہے۔ جدید شاعروں کو بھی سیاسی اور سماجی مسائل کا شعور ہے، لیکن وہ اس

شعور کو اپنی ذات سے ہم آہنگ کر کے شاعری میں ظاہر کرتے ہیں۔ اسی لیے اس کی لَے بلند نہیں ہونے پاتی، شہریار کی شاعری میں اس خصوصیت کے ساتھ ایک دوسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ابہام کا شکار نہیں ہوتے، ابہام شاعری میں حسن پیدا کرتا ہے بشرطیکہ وہ اہمال کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ شہریار اس راز سے واقف ہیں، اسی لیے بعض اور جدید بلکہ جدید تر شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھول بھلیاں نہیں بنتی، ان کے مصرعوں، شعروں، نظموں اور غزلوں میں سفر کر کے آپ کا ذہن بھٹکتا نہیں بلکہ اس سفر کا مقصود بھی پالیتا ہے۔

شہریار کے موضوعات وہی ہیں، جو آج کے بیشتر شاعروں کے موضوعات ہیں۔ اپنی ذات، اُس کی زخم شماری، خواب دیکھنے اور ان کی تعبیر ڈھونڈنے کا عمل، عشق اور اس جذبے کی مختلف و متنوع تصویریں، زندگی کی چھوٹی چھوٹی محرومیاں، خوشیاں، امید و بیم۔ اپنے ایسے دوسرے انسانوں کے مسائل اور ان کا غم۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر بہتر زندگی کی آرزو اور اس کو پانے کے لیے لڑنے کا حوصلہ، ایسی باتیں کسی بیمار اور شکست خوردہ ذہن کی پیداوار نہیں ہوتیں، یہ صحت مند زندگی اور صحت مند ذہن کے مسائل ہیں، اور اسی لیے توجہ کے طالب ہیں۔ اب تک جدید شاعری اور جدید شاعروں کو ہمدردانہ نظر سے کم ہی پڑھا گیا ہے، اگر تعصب کی عینک اتار دی جائے، اور نظم کی ہیئت میں نئے تجربوں اور معانی و بیان کے نئے راستے ڈھونڈنے کی کوشش کو بدعت نہ سمجھا جائے تو اس شاعری میں ہمارے لیے فکر و نظر کا بہت کچھ سامان مل سکتا ہے۔ پچھلے آٹھ دس برسوں میں مختصر تر نظم لکھنے کا جو تجربہ کیا گیا، شہریار کی نظمیں اس کی اچھی مثال ہیں، ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہ معمے ہیں نہ پہیلیاں، چٹکلے ہیں نہ لطیفے، بلکہ ایسے لخت ہائے جگر ہیں جن میں ہمارے عہد کا ادبی مزاج بھی ملتا ہے اور آج کے انسان کے دل کا خون بھی۔ شہریار کی آواز میں جو نغمگی کی کیفیت، دردمندی اور ہلکا سا تفکر ملتا ہے وہ انھیں ایک خاص انفرادیت عطا کر رہا ہے۔ ابھی انھیں اپنی انفرادیت کو اور چمکانا ہے۔ شاعری میں پیشین گوئی بہت مشکل ہے، ادب کا قاری یا تنقید نگار ''عالم الغیب'' تو ہوتا بھی نہیں لیکن محتاط رہ کر شہریار کے لیے اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر وہ اپنی آواز اور لہجے کی انفرادیت کی تلاش میں تھک ہار کر نہ بیٹھ رہے تو وہ اپنے لہجے کی انفرادیت

سے جدید شاعری میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کامیابی سے اردو شاعری کے لیے بھی نئے راستے کھل سکتے ہیں، یہی کیا کم ہے کہ آج بھی ان کی آواز دوسروں سے الگ پہچانی جاتی ہے۔

شہریار کی شاعری کے جن عناصر اور خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ ان کی نظموں میں بھی ملتی ہیں، اور غزلوں میں بھی۔ آزادی کے بعد برصغیر کے دونوں حصوں میں غزل کا احیا ہوا، اور ساتھ ہی غزل کو اس کے محدود اور علایم و رموز کی دنیا سے باہر بھی نکالا گیا، شہریار کی غزل بھی اسی عہد کی پیداوار اور اسی کوشش کی آئینہ دار ہے، یہ آواز غزل کی پچھلی آوازوں سے مختلف ہے کیونکہ یہ ایک نئے زمانے کی آواز ہے، اس میدان میں بھی شہریار افراط و تفریط سے دامن بچائے رہے، ان کی غزل اتنی زیادہ جدید نہیں کہ اس میں درخت ہی درخت اور طوطے ہی طوطے نظر آئیں، انسان کا پتہ چلے، نہ اس کی آواز سنائی دے، وہ کلاسیکی روایات سے آگاہ بھی ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں، اسی لیے ان کی غزلوں میں تغزل کا رچا ہوا مذاق اور رکھ رکھاؤ موجود ہے۔ ان کی غزلوں کے اشعار میں بھی ایک دُکھے ہوئے دل کی تمام کیفیات ہیں، یہی اُن کی نشتریت کا بھی راز ہے، غزلوں کے کچھ اشعار ثبوت کے طور پر نقل کرنے کے بجائے میں یہ چاہوں گا کہ آپ خود ان کو پڑھیں، ہر قاری کو ان غزلوں میں ایسے اشعار ضرور مل جائیں گے جو دل میں نشتر بن کر اتر جائیں اور اس درد میں بھی ایک گونہ لذت حاصل ہو۔

آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ یہ مجموعہ، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، ایک شاعر کی چند برسوں کی فنی ریاضت کا پہلا ثمر ہے، اسے اسی نظر سے پڑھیے، ہمدردی اور ادبی دیانت داری کے ساتھ ایک حساس نوجوان کے طرزِ احساس اور اندازِ بیان کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، اگر آپ نے ایسا کیا تو جدید شاعری کے خلاف جو تعصب دلوں میں بغیر اسے پڑھے، پرورش پا رہا ہے وہ دور ہو سکتا ہے۔ یہ مجموعہ اردو کی جدید شاعری کی مثال بھی ہے اور اس کے آیندہ بروئے کار آنے والے امکانات کا آئینہ بھی۔

وحید اختر
شعبۂ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۲ر اگست ۱۹۶۵

نظمیں

خواب

نغمگی آرزو کی بکھری ہے
رات شرما رہی ہے اپنے سے
ہونٹ امید کے پھڑکتے ہیں
پاؤں حسرت کے لڑکھڑاتے ہیں
دور پلکوں سے آنسوؤں کے قریب
نیند دامن سمیٹے بیٹھی ہے
خواب تعبیر کے شکستہ دل
آج پھر جوڑنے کو آئے ہیں

وقت

نقش ہیں ہم پیروں کے اُس کے
جب ہی پیچھے چھوڑ گیا ہے
اپنی راہ چلا جاتا ہے
ہم اور تم احساس کے پتلے
سوچ رہے ہیں
شاید دیکھے مُڑ کے ادھر بھی
ہم سا وہ نادان نہیں ہے
وہ کوئی انسان نہیں ہے

مستقبل

صبا کے ہاتھوں سے زخم خوردہ گلوں کے دامن اُلجھ رہے ہیں
کلی شگوفے کے بازوؤں میں بہک رہی ہے
ہر ایک کونپل مہک رہی ہے
زبان پتوں کی کھل رہی ہے
چمن کی رنگت بدل رہی ہے
چراغ شبنم کے بُجھ چکے ہیں
جلاوطن نکہتوں کی نظریں
کسی کی آمد کی منتظر ہیں
زمین محور سے ہٹ رہی ہے
خزاں کی زنجیر توڑنے کو
بہار گلشن میں آ رہی ہے

آخری سانس

شمع کی لَو نے جب آخری سانس لی
آخرِ شب
نگاہوں سے گرنے لگی اوس
پہلو بدلنے لگی
راہ کی جاگتی گرد
سونے لگی رات
اور خامشی گیت بننے لگی
نقشِ بے خواب پیروں کے چلنے لگے
حال و ماضی کہیں آنکھ ملنے لگے
منزلوں کے نشاں چیختے رہ گئے

موت

ابھی نہیں ابھی زنجیرِ خواب برہم ہے
ابھی نہیں ابھی دامن کے چاک کا غم ہے
ابھی نہیں ابھی درباز ہے امیدوں کا
ابھی نہیں ابھی سینے کا داغ جلتا ہے
ابھی نہیں ابھی پلکوں پہ خوں مچلتا ہے
ابھی نہیں ابھی کم بخت دل دھڑکتا ہے

پیغام

کشمکش سے مفر کب ہوا ہے جو ہو
جنبشِ چشمِ ساقی کو پہچان لو
دل کے ہنستے لہو کی دعائیں سنو
گردشِ چرخ کو
مے کے اک جام میں دیکھ لو
میکشو
تشنگی
زندگی کی علامت ہے
پیتے رہو

شمعِ آشفتہ سر

شمعِ آشفتہ سر
کیا خبر
کس لیے جل بجھی

صبح کی گود بھرنے
پتنگے چلے

سوئی شبنم جگی
کھل گئی ہر کلی
خواب کی تال پر
نیند کی تھال پر
رات بھر رقص کر
شمعِ آشفتہ سر

آرزو

سوتے سوتے چونک اٹھی جب پلکوں کی جھنکار
آبادی پر ویرانے کا ہونے لگا گمان
وحشت نے پر کھول دیے اور دُھندلے ہوئے نشان
ہر لمحے کی آہٹ بن گئی سانپوں کی پھنکار
ایسے وقت میں دل کو ہمیشہ سوجھا ایک اُپائے
کاش کوئی بے خواب دریچہ چپکے سے کھل جائے

آخرِ شب

کوئی صورت ہو الزام کی دوستو
رو چکی بے کسی شام کی دوستو
بجھ چکی چاندنی بام کی دوستو

وعدہ و عہد و پیمان کچھ بھی نہیں
دل بہلنے کا سامان کچھ بھی نہیں

چشمِ خونبار میں خواب اُترے کوئی
آخرِ شب ہے مہتاب اُبھرے کوئی

آدرش

کیسی ہے یہ رسم بتاؤ کیا ہے یہ آدرش
مان کی خاطر جان گنوائی دل کی خاطر پریت
رات کی خاطر صبح بنائی ہار کی خاطر جیت
چاند کی خاطر شہر بنائے دشت کی خاطر قہر
آنکھ کی خاطر اشک بنائے جام کی خاطر زہر
جسم کی خاطر فرش بنایا روح کی خاطر عرش
گرد کی خاطر راہ بنائی راہ کی خاطر خار
بوجھو تو پاگل کا سپنا سمجھو تو سنسار

قبرستان

زمیں کا وہ حصّہ

جہاں ہے ازل سے ابد ہی کا پہرا
طلسمی چراغوں میں لپٹی ہوئی عود وعنبر کی خوشبو

جہاں خیمہ زن ہے
زمانوں کی صدیوں کی لمحوں کی
غمخواریاں جس نے کی ہیں
جہاں ساری تہذیبیں شرمائی سی
سر برہنہ کھڑی ہیں
جہاں ہم سے خلوت گزیدہ گنہگار بندوں کی
اک انجمن ہے
زمیں کا وہ حصّہ حقیقت ہے ارض وسما کی
خودی کی خدا کی!

تضاد

کسی ایک چہرے کا ہنستا ہوا عکس
تیری گلی میں
کسی ایک لمحے سے یہ کہہ رہا تھا
کہ بیتے ہوئے وقت کی رہگذر پر
مجھے ڈھونڈنے تم نہ آنا کبھی اب
اسی ایک چہرے اسی ایک لمحے کو
بیتے ہوئے وقت کی رہگذر پر
گلے ملتے پھر آج دیکھا ہے میں نے
مگر یہ یقیں ہے
کہ تیری گلی میں
کسی اور چہرے کا ہنستا ہوا عکس
یونہی
کسی اور لمحے سے یہ کہتا ہوگا
کہ بیتے ہوئے وقت کی رہگذر پر
مجھے ڈھونڈنے تم نہ آنا کبھی اب

دھندلکا

منزلوں کی گود میں سمٹے ہوئے
نقش پائے رفتگاں
رہگذر کی گود سے لپٹی ہوئی
آنے والے قافلے کی آس پر
اک صدائے نیم جاں
ہے جرس کی کوکھ میں اب تک نہاں

ریت کے ذرّے شفق کی روشنی کو دیکھ کر
ساکت و بے حس فلک کے سائے میں پھیلے ہوئے
صحرا سے کچھ کہنے لگے

منزلوں کی گود میں سمٹے ہوئے
نقشِ پائے رفتگاں ہنسنے لگے

زندگی، جو آنے والی ہے

ازل اور ابد کی حدوں سے بہت دور
خاموشیوں کے
سمندر کے افسردہ ساحل سے
ٹکراتے صحرا میں دیکھو

بھٹکتی ہواؤں کے سیلاب میں
سر برہنہ صداؤں کے پیغامبر کھو گئے ہیں
کسی جاگتے سائے کی سونی آنکھوں میں
بیتے دنوں کے سسکتے سہارے
کسی اونگھتی راہ کے سرد سینے کو سہلا رہے ہیں

کسی ڈوبتے نقش کی روشنی میں
سلگتی پُراسرار سانسوں کی شہنائی کی
آرزو میں، کوئی
سنگ دل بُت سے اس کا پتا
آج بھی پوچھتا ہے

مآل

ٹمٹماتے نقش دھندلے راستے
دشتِ تنہائی میں یادوں کا غبار
کہر میں ڈوبی چراغوں کی قطار
ڈوبتا دن، آتی شب، وعدوں کی جاگ
گنگناتی ریت کی سانسوں کی تھاپ
دور سے آتے ہوئے قدموں کی چاپ
ایک نغمہ، ایک شعلہ، ایک راگ
گہہ خموشی، گہہ سکوں، گہہ اضطراب
رینگتے روشن جبیں سائے سراب
آنکھ پُرنم، ہونٹ گریاں، ہاتھ سرد
شورِ نالہ، سوزِ غم، طوفانِ درد
قاصدانِ عمرِ رفتہ کا خیال
کیا یہی ہے حسرتِ دل کا مآل؟
کیا اسی صورت کٹیں گے ماہ و سال؟

اُمیّد و بیم

میں نے اکثر انھیں آنکھوں کے دریچے سے تجھے
جھانکتے دیکھا ہے
جب لغزشِ انفاس بڑھی
تند و پُر شور صداؤں کا ہجوم
نُور افروز خلاؤں سے ہم آغوش ہوا
میں نے اکثر انھیں آنکھوں کے دریچے میں تجھے
ڈوبتے دیکھا ہے
جب تلخیِ احساس گھٹی
خامشی رختِ سفر باندھ چکی
تند و پر شور صداؤں کا ہجوم
ظلمت انگیز زمیں دوز گپھاؤں کا جگر
چیر کے
اُونگھتی تنہائی میں تحلیل ہوا

میں نے تو نے انھیں آنکھوں کے دریچے کے قریب
روشنی روتے ہوئے نور کے میناروں کو
اشک بنتے ہوئے گرتے ہوئے دیکھا ہے
تو کیوں
آندھیاں چلنے لگیں
خوف سے کانپ اُٹھیں بازو دریچوں کی لویں؟

عرفان

میں اس راستے پر کھڑا ہوں جہاں سے
کسی آشنا کے گزرنے کی امید بالکل نہیں ہے
مجھے اپنی اور اپنے جیسے
سیہ بخت انسانوں کی جستجو ہے
ازل سے ابد تک کی لمبی مسافت
اسی جستجو کے سہارے
مجھے کرنی ہوگی

مرے پاس سے جب بھی گزرا ہے کوئی
تو پوچھا ہے میں نے
مجھے اپنی اور اپنے جیسے
سیہ بخت انسانوں کی جستجو ہے
خدا کے لیے مجھ کو اتنا بتا دو
کہ اس راستے پر

مجھے منزلِ آخری کی تمنا میں
یونہی بھٹکنا ہے کب تک
مرے ہاتھ میں ہاتھ لے کر وہ بولا
مجھے اجنبی کیوں سمجھتے ہو میں بھی
تمہاری طرح منزلِ آخری کی طلب میں
بھٹکتا ہوں لیکن
تمھاری طرح منزلِ آخری کی حقیقت کو
تسلیم کرنے پہ راضی نہیں ہوں

واپسی

یہاں کیا ہے برہنہ تیرگی ہے
خلا ہے، آہٹیں ہیں، تشنگی ہے
یہاں جس کے لیے آئے تھے وہ شے
کسی قیمت پہ بھی ملتی نہیں ہے
جو اپنے ساتھ ہم لائے تھے وہ بھی
یہیں کھو جائے گا گر کی نہ جلدی
چلو جلدی چلو اپنے مکاں کے
کواڑوں کی جبیں پر ثبت ہوگی
کوئی دستک ابھی بیتے دنوں کی

مداوا

موم کے مقبروں میں سوتے ہیں
پگھلی شمعوں کے گرد پروانے
راتیں خاموشیوں کے آنچل میں
خود کو اب یوں چھپائے بیٹھی ہیں
جیسے ڈر ہو کہ کوئی نامحرم
دیکھ کر ان کو مسکرا دے گا

اپنے شانوں پہ منزلوں کے نشاں
لیے پھرتی ہے گردِ صحرا میں

سر برہنہ ہوا کے ہونٹوں کو
سینے آئے ہیں اجنبی لمحے
تا نہ رسوا ہو آرزوِ دل کی
بجھنے پائے نہ آس منزل کی

نیا دن نیا عذاب

سرد شاخوں پہ اُوس کے قطرے
ہیں ابھی محوِ خواب اور سورج
رتھ پہ اپنے سوار آتا ہے

خود فریبی

رات کی دیوار اٹھنے دے ابھی
شمعِ نومیدی کو جلنے دے ابھی
خشک ہونٹوں کی صدا آنے کو ہے
بھیگی زلفوں کی ہوا آنے کو ہے
نیند کی کالی گھٹا چھانے کو ہے
اس دریچے کی شکستہ انگلیاں
چھونے ہی والی ہیں گونگی بجلیاں
اپنے دل کو اپنی آنکھوں کو سنبھال
اور خلا میں خواب کا ساغر اچھال
رات کی دیوار اٹھنے دے ابھی
شمعِ نومیدی کو جلنے دے ابھی

زیست کا حاصل اور حقیقت

اندھے دن کو گونگی رات سے کیا نسبت ہے
گھائل چاند کی گہنائی کرنوں کا سایہ
اس دھرتی کو کیوں بھاتا ہے
سورج کی سرشار شعاعیں
اس دھرتی کو کیوں ڈستی ہیں
ہر 'کل' کیوں اس 'آج' کے پیکر میں ڈھلتا ہے
اور انسان کو 'آج اور کل' سے کیا ملتا ہے
کیوں ہم فانی اور امر ہیں
پل، لمحے، دن، سال اور صدیاں
یہ سب باتیں بہکی سی ہیں
لیکن اپنی زیست کا حاصل اور حقیقت صرف یہی ہیں

اجنبی

مرے پاؤں مانوس ہیں اس گلی کے
ہر اک پیچ وخم سے
یہاں مجھ کو یخ بستہ راتوں میں جلتے ہوئے سیکڑوں جسم
اک دوسرے سے اُلجھتے ملے ہیں
جنھیں ایک مبہم سی خواہش ازل کی عنایت نے بخشی
(جو شاید ابد تک رہے ساتھ ان کے)

مرے ہاتھ مانوس ہیں اس گلی کے
ہر اک گھر کی زنجیر سے
جس کو چھونے کی حسرت میں
لوگوں نے عمریں گنوا دیں
(وہی لوگ مبہم سی خواہش ازل کی عنایت نے بخشی ہے
جن کو
جو شاید ابد تک رہے ساتھ ان کے)

مری آنکھ مانوس ہے اس گلی کے
برہنہ چراغوں کی ہنستی لوؤں سے
جنھیں جلنے بجھنے میں کوئی پس وپیش یا عذر کل تھا نہ اب ہے

ہیں مانوس یہ پاؤں، یہ ہاتھ، یہ آنکھ جب اس گلی سے
تو میں کیوں اسے اجنبی لگ رہا ہوں
یہی اس گلی میں (نہ جانے میں کب سے)
کھڑا سوچتا ہوں

سوال

سحر دم گلِ نو کے شانوں کو چھوتا
کوئی تیز رفتار جھونکا ہوا کا
گزرنے لگا جب تو دامن سے اس کے
لپٹ کر کسی زرد رو گل نے پوچھا

"گل نو کے شاداب چہرے کو شبنم کا آنچل
پگھلتے ہوئے دن کی آنکھوں سے کب تک
چھپائے رہے گا؟"

التجا

کہاں ہو، کہاں ہو،
نئی صبح کی مہرباں نرم کرنو
مرا جسم مجھ سے بغاوت پہ آمادہ ہے
کانپتی ہے مری روح
آؤ بچاؤ
مجھے شب کے زنداں سے باہر نکالو
میں دن کے سمندر کی گہرائیاں ناپنا چاہتا ہوں!!

گیت کا جنم

میں جو ہوں آج کی شب کل نہ ہوں گا
میں کچھ ایسی نئی باتیں کہوں گا
میں شاید سب کو دیوانہ لگوں گا
صدا جو کھو گئی تھی میری، مجھ سے
ملے گی مدتوں کے بعد پھر سے

سائے

اداس شہر کی گلیوں میں رقص کرتے ہیں
بلائیں لیتے ہیں آوارہ گرد خوابوں کی
دعائیں دیتے ہیں بچھڑے ہوؤں کو ملنے کی
سنوارتے ہیں خمِ گیسوئے تمنا کو
پکارتے ہیں کسی اجنبی مسیحا کو
سمیٹ لیتا ہے جب چاند اپنی کرنوں کو
تو دن کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں
یونہی ہمیشہ طلوع و غروب ہوتے ہیں!

افسونِ امروز

ابھی صبحِ فردا کے قصّے نہ چھیڑو
ابھی دشتِ امروز میں خاک اڑتی ہے
بھٹکے ہوئے قافلوں کی
ابھی آنکھ جھپکی نہیں فاصلوں کی
ابھی خیمۂ خواب، ناکامی و نامرادی کی چنگاریوں سے
بچائے ہے خود کو
ابھی روح کو جسم کے غار میں کوئی کھٹکا نہیں ہے
ابھی دل دھڑکتا ہے آنکھیں ہیں روشن
ابھی صبحِ فردا کے قصّے نہ چھیڑو!!

پریم انت

اپنے اشکوں سے نہلا کر
نئے نئے کپڑے پہنا کر
پھولوں کی خوشبو میں بسا کر
گنگا میّا کی طوفانی
لہروں میں یوں پھینک آئے ہیں
جیسے اس دن ہی کی خاطر
ہم نے اس سے پیار کیا تھا

ماضی

دن کی دھوپ اور رات کی تاریکی کے جسم
دفن کیا کرتے تھے جس کے سائے میں
بھولی بھٹکی یادوں کے پیراہن کی بو
روز جہاں پر آتی تھی
اور دل کو بہلاتی تھی
تنہائی کا زہر غموں کی تلخی کو
پیتے تھے ہم اور امر ہو جاتے تھے
پل دو پل کو اپنے میں کھو جاتے تھے
اُس دیوار سے آج ہمیں وحشت ہوتی ہے
کیا ہوگا؟

فریب در فریب

دن کے صحرا سے جب بنی جاں پر
ایک مبہم سا آسرا پا کر
ہم چلے آئے اس طرف اور اب
رات کے اس اتھاہ دریا میں
خواب کی کشتیوں کو کھیتے ہیں!

ہم سفرو

تشنہ لب پا شکستہ ہم سفرو
اس طرف دیکھو
میری بات سنو
دل میں امید کو جگائے رہو
مشعلِ ہجر کو جلائے رہو
پاؤں پڑتی ہیں جو صدائیں انھیں
سر پٹکتی ہیں جو ہوائیں انھیں
مُڑ کے مت دیکھو، مُڑ کے مت دیکھو
دو قدم اور دُور ہے کتنا
شب کے صحرا سے صبح کا دریا!

میرے سوا

کس کی آواز کے شعلے کی لپک اٹھتی ہے
کس کی خوشبوئے بدن اُڑتی ہے
کیوں فضا بدلی ہوئی لگتی ہے
کیا کوئی اور بھی ہے میرے سوا
پھیلے ہوئے صحرا میں
زیست جس کے لیے تنہائی ہے
جستجو جس کی حقیقت کی یہاں لائی ہے
کیوں فضا بدلی ہوئی لگتی ہے
کیا کوئی اور بھی ہے میرے سوا
پھیلے ہوئے صحرا میں؟

ایک منظر

نیند کی سوئی ہوئی خاموش گلیوں کو جگاتے

گنگناتے

مشعلیں پلکوں پہ اشکوں کی جلائے

چند سائے

پھر رہے تھے

رات جب ہم خواب کی دنیا سے واپس آ رہے تھے

وہ آسماں

آسماں دکھ کے غموں کے آسماں
آسماں سیراب جو کرتے زمیں، دل کی زمیں، کو تھے سدا
جن سے سیکھی ہم نے جینے کی ادا
بے حسی کے بادلوں کی دھند میں گم ہو گئے
وہ آسماں

وہ کون تھا

وہ کون تھا، وہ کون تھا
طلسمِ شہرِ آرزو جو توڑ کر چلا گیا
ہر ایک تارِ روح کا جھنجھوڑ کر چلا گیا
مجھے خلا کے بازوؤں میں چھوڑ کر چلا گیا

ستم شعار آسماں تو تھا نہیں
اداسیوں کا رازداں تو تھا نہیں
وہ میرا جسمِ ناتواں تو تھا نہیں
تو کون تھا
وہ کون تھا؟

گیانیوں کا اُپہار

دھیان کی پُر پیچ گلیوں اور گذرگاہوں پہ
گرتے اور سنبھلتے
سانس روکے، دل سنبھالے
گیان کے پھیلے ہوئے صحرا کی جانب
چند سائے جارہے ہیں
اپنے پیروں کے نشاں ہر سمت چھوڑے جارہے ہیں
تاکہ کل ان کے سوا گر، گیان کے صحرا کی جانب کوئی آئے
تو اسے مشکل نہ کوئی پیش آئے

آشوبِ آگہی

اک گھنیرے شجر کے سائے میں
دو گھڑی بیٹھ کر یہ بھول گئے
قرض ہائے جنوں چکانے ہیں
ہم کو سورج کے ناز اٹھانے ہیں

جرم وسزا

شعاعِ مہر تھی مہتاب کی ضیا جن کو
خزاں کے جھونکے تھے مژدہ بہار کا جن کو
خود اپنی ذات میں آیا نظر خدا جن کو

وہ لوگ آج برہنہ سر و شکستہ پا
ٹھٹھک کے رہ گئے اک ایسے موڑ پر تنہا
جہاں ہے کوئی نہ امروز اور نہ فردا ہے
نہ کوئی پل ہے نہ ساعت نہ کوئی لمحہ ہے
نہ کوئی دوست کسی کا نہ کوئی دشمن ہے
ہر ایک اپنے ہی زخموں کی فکر کرتا ہے
ہر ایک اپنے ہی دل کی صدا کو سنتا ہے
ہر ایک سمت ہے اک بیکراں خلا جس میں
سیاہیوں کے گھنے، گہرے جال پھیلے ہیں
ملی ہے آج سزا اس گناہ کی ان کو
کہ یہ ہمیشہ گریزاں رہے حقیقت سے
بلندیوں کی ہوس میں فلک کو چھوتے تھے
زمیں سے رشتۂ دیرینہ توڑ بیٹھے تھے

۱

آئینہ دیکھ کے............

آئینہ دیکھ کے کتنے خوش ہو
آنکھیں روشن ہیں ابھی گالوں پہ سُرخی ہے ابھی
چہرے پہ نرمی ہے ابھی
اور سر پر ہیں گھنے، لمبے، سیہ بال ابھی
تم تو سرتاپا جواں لگتے ہو
اپنے اندر نہ مگر جھانکنا تم
ایک آئینہ وہاں بھی ہے لگا
سنتے ہیں اس میں نظر آتی ہے ہر شئے اُلٹی
کیونکہ صیقل سے وہ آئینہ ہے محروم ابھی
اس کو بھولے سے بھی گر دیکھو گے
آئینہ دیکھ کے پھر خوش نہ کبھی تم ہو گے!!

لازوال سکوت

مہیب، لمبے، گھنے، پیڑوں کی ہری شاخیں
کبھی کبھی کوئی اشلوک گنگناتی تھیں
کبھی کبھی کسی پتّے کا دل دھڑکتا تھا
کبھی کبھی کوئی کونپل درود پڑھتی تھی
کبھی کبھی کوئی جگنو الکھ جگاتا تھا
کبھی کبھی کوئی طائر ہوا سے لڑتا تھا
کبھی کبھی کوئی پرچھائیں چیخ پڑتی تھی
اور اس کے بعد مری آنکھ کھل گئی میں نے
سرہانے رکھے ہوئے تازہ روزنامے کی
ہر ایک سطر بڑے غور سے پڑھی لیکن
خبر کہیں بھی کسی ایسے حادثے کی نہ تھی
اور اس کے بعد میں دیوانہ وار ہنسنے لگا
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت

دن کا عذاب

وہ ڈھلا دن، وہ اٹھا پردۂ شام
چشمِ امید چھلکنے لگی، بھرنے لگے جام
آہٹیں سایوں سے، دل درد کے دامن سے ہوا محوِ کلام
نکہتِ زلفِ شب و روزِ گذشتہ کی صدا
راہِ تنہائی پہ آہستہ خرام

وہ بجھا داغ وہ شعلہ ہوا سرد
وا درِ خواب ہوا، ختم ہوئی شورشِ درد
ہر طرف نیند کی گرد

وہ چھٹی دُھند، وہ سورج کی شعاعوں کی پکار
تیر کی طرح سے چبھنے لگی اور سارا خمار
ایک پل میں ہوا یوں ختم کہ جیسے کوئی خواب
اور پھر دن کا عذاب

خوابوں کا بھکاری

اپنے معمول کے مطابق ہم
آج بھی روز کی طرح یوں ہی
دن کے ہمراہ بے خیالی میں
وادیٔ شام سے گزرتے ہوئے
رات کی سرحدوں کو چھولیں گے
نیند کے در کو کھٹکھٹائیں گے
لاکھ روئیں گے گڑگڑائیں گے
کاسۂ چشم میں مگر اک خواب
آج کی رات بھی نہ پائیں گے

؟

کبھی جو مجھے خواہشوں، آرزوؤں کی گمنام دنیاؤں میں
لے کے جاتا تھا
رہتا تھا ہر گام، ہر دم مرے ساتھ
کرتا تھا میری حفاظت
بلاؤں سے اندیشوں سے، خوف سے، بے حسی سے
وہی اجنبی راہبر آج مجھ کو
دعا موت کی دے رہا ہے
یہ کیا ہو رہا ہے
یہ کیوں ہو رہا ہے؟

پرچھائیاں

رات کے بے کنار صحرا میں
اپنی تنہائیوں سے لڑتی ہوئی
زخمی روحوں کی پیاسے جسموں کی
ساری پرچھائیاں شہید ہوئیں
یہ خبر تازہ روزنامے کے
کس ورق پر چھپی تھی یاد نہیں!

نیند کا جادو

اندھیرا، روشنی پھر دُھند
آنکھوں کے دریچوں پر
بہت سی دستکوں کا شور
پلکوں پر
ندا سی اوس کی فریاد
بوجھل سی فضا، سناٹا
اور پھر نیند کا جادو

شجرِ سایہ دار

تم مسافر ہو تمھیں منزل کی
جستجو ہوگی
بگولوں کا رقص
اس گذرگاہ پہ ہر روز ہی ہوتا ہے
تمھیں کیا لینا
تم آگے بڑھ جاؤ
اور یہ پیڑ تو خود
آگ اُگلتے ہوئے سورج کا گلا کرتے ہیں
ان سے سائے کی توقع ہے فضول
یہ تو ہر ایک مسافر کو یونہی روکتے ہیں

انوکھی پیشکش

سسکتی ہوئی رات، مغموم دن کی چتا میں
سلگتے ہوئے چند جسموں کی
محرومیوں کی کہانی
سُنانے کو بے چین ہے
اور مجھ کو
کوئی دلربا اور ادھورا سا سپنا
صدا دے رہا ہے

عرفان کی آخری منزل

کوئی رنگ اور زاویوں کی زباں جانتا ہے
کوئی تال سم کی فغاں جانتا ہے
کوئی لفظ و معنی کے جادو کو پہچانتا ہے
کوئی پتھروں میں چھپی داستانوں کے اسرار سے آشنا ہے
کوئی جسم کی مدھ بھری وحشتوں، دکھ بھری کروٹوں کی ادا جانتا ہے
مگر کوئی اس سے سوا جانتا ہے
مگر کوئی خود کو خدا جانتا ہے

قربِ قیامت

اندھیرے کا سر جو اُجالے کی تلوار سے کاٹتی تھی
سیہ بختوں کو روشنی بانٹتی تھی
جو تنہائی کی کھائی کو پاٹتی تھی
اُس آواز کو بھی ہوا کھا گئی ہے
قیامت بہت ہی قریب آ گئی ہے

نیند کا سیلاب

یہ مکاں
یہ خواہشوں اور آرزوؤں کے مکاں
دل کے اس اُجڑے نگر میں
آج پھر جن کو سلگتی دھوپ میں تعمیر ہے ہم نے کیا
رات کے ہونے تلک ڈھ جائیں گے
نیند کے سیلاب میں بہہ جائیں گے

سہارا

صدا دی
ان آنکھوں نے، ہونٹوں نے
اور اس دھڑکتے ہوئے دل نے میرے
صدا دی
اُداسی کے صحرا سے، تنہائی کے دشت سے
ناامیدی کی چٹانوں سے، بے حسی کے پہاڑوں سے
اکثر صدا دی
کبھی بیتے لمحوں کو، بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو
کبھی نیند کی سبز پریوں کو، خوابوں کی معصوم پرچھائیوں کو
کبھی دن کے ہنگاموں کو، رات کی خامشی کو

کبھی تیرگی کو
کبھی روشنی کو
صدا دی
کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا
ان آنکھوں کا، ہونٹوں کا
اور اس دھڑکتے ہوئے دل کا
کوئی سہارا نہیں تھا!!

ایک دو جام

ایک دو جام اور آج کی شام
دیکھو وہ سامنے کھڑی ہے رات
اے اسیرانِ گردشِ ایام

رات کے بعد صبح آئے گی
صبح کے بعد دوپہر اور شام
اور پھر رات
اک بھیانک رات
ایک دو جام اور آج کی شام

وقت کے صحرا میں

دھوپ میں تنہائی کی جسموں کو جھلساتے رہو
دوریوں کی سخت چٹانوں سے ٹکراتے رہو
اور دلوں میں خواہشوں کی آگ بھڑکاتے رہو
وقت کے صحرا میں یونہی ٹھوکریں کھاتے رہو

اب کے برس

ہوا کا تعاقب کبھی چاندنی کو پکڑنے کی خواہش
کبھی صبح کے ہونٹ چھونے کی حسرت
کبھی رات کی زلف کو گوندھنے کی تمنا
کبھی جسم کے قہر کی مدح خوانی
کبھی روح کی بے کسی کی کہانی
کبھی جاگنے کی ہوس کو جگانا
کبھی نیند کے بند دروازے کو کھٹکھٹانا
کبھی صرف آنکھیں ہی آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں ہے
کبھی کان ہیں، ہاتھ ہیں اور زباں ہے
کبھی صرف لب ہیں
دلوں کے دھڑکنے کے انداز
اب کے برس کچھ عجب ہیں

ایک اور موت

کٹ گیا دن، ڈھلی شام، شب آ گئی
پھر زمیں اپنے محور سے ہٹنے لگی
چاندنی کروٹیں پھر بدلنے لگی
آہٹوں کے سسکتے ہوئے شور سے
پھر مکاں بھر گیا
زہر سپنوں کا پی کر
کوئی آج کی رات پھر مر گیا!

وہ کیا تھی

مری گرم سانسوں کی سرگم کو سن کر
ہوا جھوم اُٹھی
بڑی دیر تک پاگلوں کی طرح وہ
مرے گرد کرتی رہی رقص
اور پھر
کسی خوف کے تیر سے زخمی ہو کر
مرے بازوؤں میں تڑپنے لگی
اور
مرے جسم کو برف کی سِل بنا کر
نہ جانے کدھر اور کہاں جا چھپی وہ
ہوا تھی کہ کوئی بلا تھی
وہ کیا تھی؟

نیا کھیل

اے اہلِ شہر آؤ چلو اس طرف چلو
تنہائیوں کی دُھند سے آگے ذرا اُدھر
وہ سامنے کھلا ہوا میدان ہے جہاں
اک ایسا کھیل پیش کیا جائے گا وہاں
جو آج تک کسی نے بھی دیکھا نہیں کبھی
یعنی، تمھاری جاگتی آنکھوں کے سامنے
آوازوں کے نجوم، صداؤں کے ماہتاب
سناٹوں کی صلیب پہ لٹکائے جائیں گے

سائے کی موت

دن کا دروازہ ہوا بند شبِ تار آئی
راستے کروٹیں لینے لگے
گلیوں میں اُداسی چھائی
سارے ہنگامے، وہ سب رونقیں (دن کی ہمراز)
گونگی جیلوں میں ہوئیں قید
چلو اب نکلیں
اپنی تنہائی کے اس خول سے باہر
دیکھیں
اپنا سایہ کہاں جاتا ہے شبِ تار میں آج
کون سی یادوں کو چمکاتا ہے
کس پل کو صدا دیتا ہے
آج کیا کھوتا ہے، کیا پاتا ہے
کس طرح بڑھتا ہے، گھٹتا ہے، بکھر جاتا ہے
کیسے مر جاتا ہے؟

نیا امرت

دواؤں کی الماریوں سے سجی اک دوکاں میں
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
اک انساں کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو ''زہر'' لکھا ہوا ہے
اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے؟

ایک رات ایک منظر

ہچکیوں کے پیچ و خم کے سلسلے
آہٹوں کے گھٹتے بڑھتے دائرے
آنسوؤں سے تر بہ تر تنہائیاں
دُھند میں ملبوس کچھ سرگوشیاں
زرد رو مہتاب اور گرما کی رات
آسماں کی سمت اک سائے کے ہاتھ

ایک لمحے سے دوسرے لمحے تک

ایک آہٹ ابھی دروازے پہ لہرائی تھی
ایک سرگوشی ابھی کانوں سے ٹکرائی تھی
ایک خوشبو نے ابھی جسم کو سہلایا تھا
ایک سایہ ابھی کمرے میں مرے آیا تھا
اور پھر نیند کی دیوار کے گرنے کی صدا
اور پھر چاروں طرف تیز ہوا!!

غزلیں

○○○

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو!
تاحدّ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

○○○

مشعلِ درد پھر ایک بار جلا لی جائے
جشن ہو جائے ذرا دھوم مچا لی جائے

خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گزرا
دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے

جان بھی میری چلی جائے تو کچھ بات نہیں
وار تیرا نہ مگر ایک بھی خالی جائے

جو بھی ملنا ہے ترے در ہی سے ملنا ہے اسے
در ترا چھوڑ کے کیسے یہ سوالی جائے

وصل کی صبح کے ہونے میں ہے کچھ دیر ابھی
داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھا لی جائے

○○○

حوصلہ دل کا نکل جانے دے
مجھ کو جلنے دے پگھل جانے دے

آنچ پھولوں پہ نہ آنے دے مگر
خس و خاشاک کو جل جانے دے

مدّتوں بعد صبا آئی ہے
موسمِ دل کو بدل جانے دے

چھا رہی ہیں جو مری آنکھوں پر
ان گھٹاؤں کو مچل جانے دے

تذکرہ اُس کا ابھی رہنے دے
اور کچھ رات کو ڈھل جانے دے

○○○

دیارِ دل نہ رہا بزمِ دوستاں نہ رہی
اماں کی کوئی جگہ زیرِ آسماں نہ رہی

رواں ہیں آج بھی رگ رگ میں خون کی موجیں
مگر وہ ایک خلش وہ متاعِ جاں نہ رہی

لڑیں غموں کے اندھیروں سے کس کی خاطر ہم
کوئی کرن بھی تو اس دل میں ضوفشاں نہ رہی

میں اس کو دیکھ کے آنکھوں کا نور کھو بیٹھا
یہ زندگی مری آنکھوں سے کیوں نہاں نہ رہی

زباں ملی بھی تو کس وقت بے زبانوں کو
سنانے کے لیے جب کوئی داستاں نہ رہی

○○○

دامِ الفت سے چھوٹتی ہی نہیں
زندگی تجھ کو بھولتی ہی نہیں

کتنے طوفاں اٹھائے آنکھوں نے
ناؤ یادوں کی ڈوبتی ہی نہیں

تجھ سے ملنے کی تجھ کو پانے کی
کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہیں

ایک منزل پہ رُک گئی ہے حیات
یہ زمیں جیسے گھومتی ہی نہیں

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے
غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں

○○○

اہلِ جہاں یہ دیکھ کے حیران ہیں بہت
دستِ ستم ہے ایک، گریبان ہیں بہت

ہم نے تمام عمر سنوارا انھیں مگر
گیسوئے زیست پھر بھی پریشان ہیں بہت

یہ اور بات دل کو ہیں بے مہریاں ہی یاد
ہم پر وگرنہ آپ کے احسان ہیں بہت

شرمندہ دوست ہی سے نہیں شہریار ہم
دشمن سے بھی تو آج پشیمان ہیں بہت

○○○

ہوا سے اُلجھے کبھی سایوں سے لڑے ہیں لوگ
بہت عظیم ہیں یارو بہت بڑے ہیں لوگ

اسی طرح سے بجھے جسم جل اُٹھیں شاید
سُلگتی ریت پہ یہ سوچ کر پڑے ہیں لوگ

سُنا ہے اگلے زمانے میں سنگ و آہن تھے
ہمارے عہد میں تو مٹی کے گھڑے ہیں لوگ

ہوا کا جھونکا بھی جس راہ پر نہیں آتا
نہ جانے کس لیے اس راہ پر کھڑے ہیں لوگ

○○○

وہ بے وفا ہے ہمیشہ ہی دل دُکھاتا ہے
مگر ہمیں تو وہی ایک شخص بھاتا ہے

نہ خوش گمان ہو اس پر تو اے دلِ سادہ
سبھی کو دیکھ کے وہ شوخ مسکراتا ہے

جگہ جو دل میں نہیں ہے مرے لیے نہ سہی
مگر یہ کیا کہ بھری بزم سے اٹھاتا ہے

ترے کرم کی یہی یادگار باقی ہے
یہ ایک داغ جو اس دل میں جگمگاتا ہے

عجیب چیز ہے یہ، وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

○○○

کاش پوچھے یہ چارہ گر سے کوئی
کب تلک اور یونہی ترسے کوئی

کون سی بات ہے جو اُس میں نہیں
اُس کو دیکھے مری نظر سے کوئی

سچ کہے سن کے جس کو سارا جہاں
جھوٹ بولے تو اس ہنر سے کوئی

یہ نہ سمجھو کہ بے زبان ہے وہ
چُپ اگر ہے کسی کے ڈر سے کوئی

ہجر کی شب ہو یا وصال کی شب
شب کو نسبت نہیں سحر سے کوئی

○○○

یہ کیا جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے
حدِ نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے

ہر ایک جسم روح کے عذاب سے نڈھال ہے
ہر ایک آنکھ شبنمی، ہر ایک دل فگار ہے

ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں پہ بھی یقیں نہیں
خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے

نہ جس کا نام ہے کوئی، نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

○○○
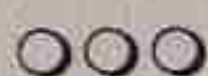
ماہ و انجم رہے غمیں شب بھر
کوئی روتا رہا کہیں شب بھر

ان کے وعدے کا ذکر کیا کیجئے
آہٹیں گونجتی رہیں شب بھر

زندگی جیسے ہوش میں آئے
رونقیں اس طرح کی تھیں شب بھر

غم سے گھبرا گئے تو پرسش کو
کتنی پرچھائیاں اُٹھیں شب بھر

آس کا در، اُمید کا دامن
وحشتیں دیکھتی رہیں شب بھر

خشک پتوں کے ڈھیر میں کس کو
نکہتیں ڈھونڈتی رہیں شب بھر

تھا غضب جاگنا تمنا کا
رقص کرتی رہی زمیں شب بھر

ہر پتنگے کے پر سلامت ہیں
شمعیں بے بات کیوں جلیں شب بھر

○○○

ہجومِ درد ملا، زندگی عذاب ہوئی
دل و نگاہ کی سازش تھی کامیاب ہوئی

تمہاری ہجر نوازی پہ حرف آئے گا
ہماری مونس و ہمدم اگر شراب ہوئی

یہاں تو زخم کے پہرے بٹھائے تھے ہم نے
شمیمِ زلف یہاں کیسے باریاب ہوئی

ہمارے نام پہ گر اُنگلیاں اُٹھیں تو کیا
تمہاری مدح و ستائش تو بے حساب ہوئی

ہزار پُرسشِ غم کی مگر نہ اشک بہے
صبا نے ضبط یہ دیکھا تو لاجواب ہوئی

○○○
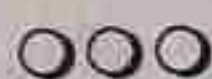
متاعِ عمر ہی کیا، جاتی رایگاں یوں بھی
ادا ہوا نہ مگر قرضِ دوستاں یوں بھی

ضرور کیا تھا کہ تم بھی کرو کرم سے گریز
ہمیں تو یاد تھی بے مہریِٔ جہاں یوں بھی

بہانہ مل گیا اِس کو ترے تغافل کا
وگرنہ دل کو تو ہونا تھا بدگماں یوں بھی

زبانِ غیر کو دیتے ہیں درسِ طرزِ سخن
ستم نصیب کیا کرتے ہیں فغاں یوں بھی

○○○

بے تاب ہیں اور عشق کا دعویٰ نہیں ہم کو
آوارہ ہیں اور دشت کا سودا نہیں ہم کو

غیروں کی محبت پہ یقیں آنے لگا ہے
یاروں سے اگرچہ کوئی شکوہ نہیں ہم کو

نیرنگیٔ دل ہے کہ تغافل کا کرشمہ
کیا بات ہے جو تیری تمنا نہیں ہم کو

یا تیرے علاوہ بھی کسی شے کی طلب ہے
یا اپنی محبت پہ بھروسا نہیں ہم کو

یا تم بھی مداوائے الم کر نہیں سکتے
یا چارہ گرو فکرِ مداوا نہیں ہم کو

یوں برہمیٔ کاکل امروز سے خوش ہیں
جیسے کہ خیالِ رُخِ فردا نہیں ہم کو

○○○

جنوں کے نغمے، وفاؤں کے گیت گاتے ہوئے
ہماری عمر کٹی زخمِ دل چھُپاتے ہوئے

جہاں میں ہم نے فقط اک تمھیں کو چاہا ہے
تمھیں خیال نہ آیا یہ دل دُکھاتے ہوئے

ہمیں بھی زندگی کرنے کا حوصلہ تھا کبھی
ہمیں بھی لوگوں نے دیکھا ہے مسکراتے ہوئے

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنا لے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

○○○

سوا ہے آج تیرگی کہ بے کلی دوچند ہے
مجھے جو جستجوئے غمگسارِ دردمند ہے

جو چند لمحے وقت نے دیے ہیں ان کا کیا کریں
درِ حبیب وا نہیں، درِ حیات بند ہے

تمھارا اور میرا اب نباہ ہو تو کیسے ہو
مجھے وفا عزیز ہے، تمھیں جفا پسند ہے

وہ میں نہیں، عدو سہی، خوشی یہ ہے کہ دہر میں
کوئی تو سرخرو ہوا، کوئی تو سربلند ہے

عزیزِ شہر آپ کی یہ منصفی بھی خوب ہے
ہوس کو چھوٹ ہے کھلی جنوں پہ قید و بند ہے

○○○

دوستوں میں نہیں وہ بات جو اغیار میں ہے
سچ یہی ہے پہ تامل ہمیں اظہار میں ہے

اک وفا پیشہ نے کرلی ہے وفا سے توبہ
تذکرہ آج یہی کوچہ و بازار میں ہے

عمر بھر دیکھا کیے اس کی طرف یوں جیسے
سارے عالم کی حقیقت نگہٗ یار میں ہے

ایک عالم ہے کہ اُس سمت کھنچا جاتا ہے
جانے وہ کون سی خوبی رسن و دار میں ہے

○○○

شمعِ دل، شمعِ تمنّا نہ جلا مان بھی جا
تیز آندھی ہے، مخالف ہے ہوا مان بھی جا

ایسی دنیا میں جنوں، ایسے زمانے میں وفا
اس طرح خود کو تماشا نہ بنا مان بھی جا

کب تلک ساتھ ترا دیں گے یہ دھندلے سائے
دیکھ نادان نہ بن میرا کہا مان بھی جا

زندگی میں ابھی خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی
زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑا مان بھی جا

شہر پھر شہر ہے یاں جی تو بہل جاتا ہے
شہر سے بھاگ کے صحرا کو نہ جا مان بھی جا

پھر نہ کچھ ہوگا اگر بعد میں پچھتایا تو
وقت ہے اب بھی ذرا ہوش میں آ مان بھی جا

○○○

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

ہر ایک نقش تمنا کا ہو گیا دُھندلا
ہر ایک زخم مرے دل کا بھر گیا یارو

بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرق آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اُتر گیا یارو

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اُسے
سُنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

○○○

لاکھ خورشید سرِ بام اگر ہیں تو رہیں
ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے

ہر گلی کوچے میں رسوا ہوئے جن کی خاطر
کیا خبر تھی کہ وہی لوگ بدل جائیں گے

ان کے پیچھے نہ چلو، ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

قافلے نیندوں کے آئے ہیں انھیں ٹھہرا لو
ورنہ یہ دُور بہت دُور نکل جائیں گے

○○○

کس فکر کس خیال میں کھویا ہوا سا ہے
دل آج تیری یاد کو بھولا ہوا سا ہے

گلشن میں اس طرح سے کب آئی تھی فصلِ گل
ہر پھول اپنی شاخ سے ٹوٹا ہوا سا ہے

چل چل کے تھک گیا ہے کہ منزل نہیں کوئی
کیوں وقت ایک موڑ پہ ٹھہرا ہوا سا ہے

کیا حادثہ ہوا ہے جہاں میں کہ آج پھر
چہرہ ہر ایک شخص کا اُترا ہوا سا ہے

نذرانہ تیرے حُسن کو کیا دیں کہ اپنے پاس
لے دے کے ایک دل ہے سو ٹوٹا ہوا سا ہے

پہلے تھا جو بھی، آج مگر کاروبارِ عشق
دنیا کے کاروبار سے ملتا ہوا سا ہے

لگتا ہے اس کی باتوں سے یہ شہریار بھی
یاروں کے التفات کا مارا ہوا سا ہے

○○○

ذکر کسی کا پھر نکلا، پھر چھائی اداسی محفل پر
آج کی رات کڑی گزرے گی شاید پھر اہل دل پر

میری محبت کے انجام کی فکر تمھیں اتنی کیوں ہے
جو کچھ بھی بیتے گی یارو بیتے گی میرے دل پر

چاہے جتنا تیز چلو مجھ سے تم میرے ہم سفرو
پہنچ نہ پاؤ گے تم لیکن مجھ سے پہلے منزل پر

فرصت وقت نے دی تو ہم بھی لکھیں گے اس کی روداد
کیسے طوفانوں سے نکلے، پہنچے کیسے ساحل پر

○○○

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

دھوپ کے قہر کا ڈر ہے تو دیارِ شب سے
سر برہنہ کوئی پرچھائیں نکلتی کیوں ہے

مجھ کو اپنا نہ کہا اس کا گلا تجھ سے نہیں
اس کا شکوہ ہے کہ بیگانہ سمجھتی کیوں ہے

تجھ سے مل کر بھی نہ تنہائی مٹے گی میری
دل میں رہ رہ کے یہی بات کھٹکتی کیوں ہے

مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو مری وحشت کا سبب
بوئے آوارہ سے پوچھو کہ بھٹکتی کیوں ہے

○○○

دل کو شہیدِ رنج و الم ہو جانے دو
اس دھرتی کو اور بھی نم ہو جانے دو

لطف و کرم کی بارش بھی ہو جائے گی
ختم یہ موسمِ جور و ستم ہو جانے دو

چند دنوں تک اور یونہی خاموش رہو
سناٹوں کے شور کو کم ہو جانے دو

راہِ تمنا کو انگڑائی لینے دو
روشن اک اک نقشِ قدم ہو جانے دو

اہلِ جہاں کو باتوں میں اُلجھائے رہو
اہلِ جنوں کو تازہ دم ہو جانے دو

ایک ہی ساتھ بڑھیں گے منزل کی جانب
بچھڑے ہوئے یاروں کو بہم ہو جانے دو

پھر لکھ لینا دنیا بھر کے افسانے
پہلے قصۂ شوق رقم ہو جانے دو

○○○

دریا چڑھتے ہیں اُتر جاتے ہیں
حادثے سارے گزر جاتے ہیں

راتیں جیسی بھی ہوں ڈھل جاتی ہیں
زخم کیسے بھی ہوں بھر جاتے ہیں

کوئی ماتم نہیں کرتا اُن کا
پیدا ہوتے ہی جو مر جاتے ہیں

یادیں رہ جاتیں ہیں ڈسنے کے لیے
دن تو آتے ہیں گزر جاتے ہیں

جانے کیا ہو گیا اہلِ غم کو
دل دھڑکتا ہے تو ڈر جاتے ہیں

○○○

تجھ سے بچھڑے ہیں تو اب کس سے ملاتی ہے ہمیں
زندگی دیکھیے کیا رنگ دکھاتی ہے ہمیں

مرکزِ دیدہ و دل تیرا تصور تھا کبھی
آج اس بات پہ کتنی ہنسی آتی ہے ہمیں

پھر کہیں خواب و حقیقت کا تصادم ہوگا
پھر کوئی منزلِ بے نام بُلاتی ہے ہمیں

دل میں وہ درد، نہ آنکھوں میں وہ طغیانی ہے
جانے کس سمت یہ دنیا لیے جاتی ہے ہمیں

گردشِ وقت کا کتنا بڑا احساں ہے کہ آج
یہ زمیں چاند سے بہتر نظر آتی ہے ہمیں

اشعار

○

پیاس مکروہ ہونے لگی ہے مری
اے سرابو! مرا راستہ چھوڑ دو

○

جانے دیوار سے اُلجھی کہ کسی خوشبو سے
سوئے گلزار گئی لوٹ کے آئی نہ صبا

○

چین لینے نہیں دیتی مری وحشت مجھ کو
اور کچھ دُور مرے شہر سے صحرا ہو جائے

○

یہ اضطراب ازل سے مرا مقدر ہے
میں کچھ کروں پہ مرا جی بہل نہیں سکتا

○

ہمیں یقین ہے تو آج بھی نہ آئے گا
تمام رات مگر پھر بھی جاگنا ہے ہمیں

ترے کرم کو ستم میں بدلتے دیکھ لیا
اب اور کیا ہے جو دنیا میں دیکھنا ہے ہمیں

○

وقت کو کیوں بُرا بھلا کہیے
تجھ کو ہونا ہی تھا جُدا ہم سے

○

ہونے کو ہے بہت ہی بڑا کوئی حادثہ
لگنے لگی ہے شکل تری اجنبی ہمیں

چاہا ہے تجھ کو تیرے تغافل کے باوجود
اے زندگی تو یاد کرے گی کبھی ہمیں

○

مدتوں سے ملے نہیں ہم لوگ
درمیاں کوئی فاصلہ تو نہیں

صبح سے دل اُداس ہے میرا
رات میں خواب میں ہنسا تو نہیں

○

ہیں ختم اہلِ درد پہ یہ وضع داریاں
جس موڑ پر ملے تھے اُسی پر جدا ہوئے

مانا کہ دوستوں کو نہیں دوستی کا پاس
لیکن یہ کیا کہ غیر کا احسان لیجیے

○

جواز سیکڑوں مل جائیں گے تغافل کے
نگاہِ دوست خدارا نہ یوں پشیماں ہو

○

طوفاں تو کیا کنارا بھی آیا نہ سازگار
برہم کچھ اتنی موجِ بلا ہم سے ہو گئی

○

کچھ نہیں کھلتا کہ کیوں میرے قدم جاتے ہیں
ایسی منزل کی طرف جس کا پتا کچھ بھی نہیں

○

آہٹوں کے فسوں میں دروازے
دستکوں کی زباں کو بھول گئے

منزلوں کے خیال میں گُم تھے
ہم اگر رفتگاں کو بھول گئے

○

مجھ کو لے ڈوبا ترا شہر میں یکتا ہونا
دل بہل جاتا اگر کوئی بھی تجھ سا ہوتا

○

قافلے آئے بھی چلے بھی گئے
ہے ہمیں انتظار اب کس کا

○

دل تھا کہ ضد رہی ترے کوچے میں عمر ہو
رہنے کو یوں تو گوشۂ صحرا ہمیں بھی تھا

○

دیکھا جو آج غور سے ہم نے تو یہ کھلا
اُن آنکھوں میں حیا کے سوا اور کچھ بھی ہے

اس کرب اس خلش کا مگر کیا جواب ہے
ملنے کو تیرے در سے ملا اور کچھ بھی ہے

○

آنکھوں میں تیری دیکھ رہا ہوں میں اپنی شکل
یہ کوئی واہمہ یہ کوئی خواب تو نہیں

ساتواں در

(۱۹۶۹)

صدیق احمد صدیقی
کے نام

نظمیں

حسرتِ خواب

کوئی پتھر کسی کے ہاتھ سے چھوٹا
طلسمِ آرزو ٹوٹا
سنو! خاموشی کے بے حس سمندر میں ہوئی ہلچل
چلو آنکھوں کے طاقوں میں
ادھورے چاند کی
ٹوٹی ہوئی کرنیں سجا دیں
اور سو جائیں

خوف کا قہر

وہ بڑھ رہا ہے، مری سمت رک گیا دیکھو
وہ مجھ کو گھور رہا ہے، وہ اس کے ہاتھوں میں
چمکتی چیز ہے کیا، اور اس کی آنکھوں سے
وہ کیسی سرخ سی سیال شے ٹپکتی ہے
وہ اس کے ہونٹ ہلے، وہ ببول کی شاخیں
کراہنے لگیں، وہ چیل اور کوؤں کے
پروں کے شور سے سناٹوں کا فسوں ٹوٹا
وہ چونک اٹھا، وہ پیچھے مڑا، وہ چلنے لگا
وہ تیز تیز، بہت تیز تیز چلنے لگا
وہ اک غبار سا، وہ دھند سی، نگاہوں کی
حدوں سے دور، بہت دور جا چکا ہے وہ
وہ کون تھا، وہ مری سمت بڑھ رہا تھا کیوں؟

اڑان

تری گرم سانسوں کی سرگم سے بدمست ہونے لگیں
شاخِ تنہائی کی نرم بھیگی ہوئی پتیاں
ہر گذرگاہ پر لڑکھڑانے لگیں
سرمئی سبز پرچھائیاں
آسماں پر افق تا افق لہلہانے لگیں
خواب کی کھیتیاں
موج در موج سرگوشیوں کی صبا
سرخ ہونٹوں کو بوسوں سے سرشار کرنے لگی
اک نیا جرم کرنے پہ اصرار کرنے لگی
جھاڑیوں میں ہوا سرسرانے لگی
جسم پگھلی ہوئی آگ میں غسل کرنے لگے

ساعتوں کا سفر

بند دروازے اور کھڑکیاں
ایک اک کرکے کھلنے لگیں
رس میں ڈوبی ہوائیں
نئے موسموں کی پراسرار بے نام امیدوں کے گیت گانے لگیں
دوریوں کے دھند لکے چھٹے
قرب کے صاف و شفاف سورج سے پھر
آسمانِ جنوں جگمگانے لگا
نور اور رنگ کا سیل اس سمت سے اس طرف
اور ادھر سے ادھر آنے جانے لگا
زخم سب مندمل ہو گئے
دل دھڑکنے کا آہنگ پا ہی گیا
ساعتیں کا سفر راس آ ہی گیا

اندھیرے کے صحراؤں میں

اندھیرے کے صحراؤں میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں کسی کو
چھپائے ہوئے روح اور جسم کی تشنگی کو
ہزاروں برس ہو گئے اس سفر کو
جرس کی صدا، راہبر ہے، نہ منزل کا کوئی پتہ ہے
نگاہوں کی سرحد خلا ہی خلا ہے
ابھرتے ہیں کچھ نقش، کچھ دھندلے سائے
کبھی ایک پل کو
مگر پھر وہی بیکراں دشت و صحرا
وہی اضطراب اور آوارگی اور تنہائیاں ہیں
چھپائے ہوئے روح اور جسم کی تشنگی کو
اندھیرے کے صحراؤں میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں کسی کو
ہزاروں برس ہو گئے اس سفر کو

زوال کی حد

بوتل کے اندر کا جن
نکلے تو اس سے پوچھیں
جینے کا کیا ڈھنگ کریں
کن سپنوں سے جنگ کریں

کھولو سوڈا لاؤ گلاس
دو آنے کے سیخ کباب
سگریٹ بھی لیتے آنا

پارک میں کیا وہ آئی تھی
آج بھی کیا شرمائی تھی
کیسے کپڑے پہنے تھی
کیا انداز تھا جوڑے کا
تم نے اس سے پوچھا تھا
رات جو تم نے سوچا تھا

فیض کی تازہ نظم پڑھی
اور بیدی کا افسانہ
'لوپ' سے کیا حاصل ہوگا
دریا کیا ساحل ہو گا

بھوک سے جنتا مرتی ہے
پنجابی صوبے کے بعد
چین نئی دھمکی دے گا
اندرا جی کے بھاشن میں
پنڈت جی کی بات کہاں
شاستری اردو بولتے تھے
جن سنگھی کیوں سنتے تھے
آج کسی کی برسی تھی
ویسٹ انڈیز ہی جیتے گا

تھوڑا سوڈا اور ملاؤ
کدھر لوٹری ہے بتلاؤ
تم اتنے خاموش ہو کیوں؟
نظم کوئی کہہ ڈالی کیا

تو پھر کیا ہے ہو جائے
لیکن شرط ترنم ہے

پنکھے کی اسپیڈ بڑھاؤ
کٹھمنڈو نیپال میں ہے
سارتر کی بیوی کیسی ہے
ہم بندر کے پوتے ہیں
میرٹھ سے قینچی بھی لائے

لایعنی ہیں مرگ و زیست
بے معنی ہیں سب الفاظ
بے حس ہے مخلوقِ خدا
ہر انساں اک سایہ ہے
شادی غم، اک دھوکا ہے
دل آنکھیں لب ہاتھ دماغ
ایک وبا کی زد میں ہیں
اپنے زوال کی حد میں ہیں

ایک اور سال گرہ

(۱۶؍جون ۱۹۶۶)

لو تیسواں سال بھی بیت گیا
لو بال روپہلی ہونے لگے
لو کاسۂ چشم ہوا خالی
لو دل میں نہیں اب درد کوئی
یہ تیس برس کیسے کاٹے
یہ تیس برس کیسے گزرے
آسان سوال ہے کتنا یہ!

معلوم ہے مجھ کو یہ دنیا
کس طرح وجود میں آئی ہے
کس طرح فنا ہوگی اک دن
معلوم ہے مجھ کو، انساں نے

کس طرح سے کی تخلیقِ خدا
کس طرح بتوں کو پیدا کیا
معلوم ہے مجھ کو میں کیا ہوں
کس واسطے اب تک زندہ ہوں
اک اس کے جواب کا علم نہیں
یہ تیس برس کیسے گزرے
یہ تیس برس کیسے کاٹے
ہاں یاد ہے اتنا میں اک دن
ٹافی کے لیے رویا تھا بہت
اماں نے مجھے پیٹا تھا بہت
ہاں یاد ہے اتنا میں اک دن
تتلی کا تعاقب کرتے ہوئے
اک پیڑ سے جا ٹکرایا تھا
ہاں اتنا یاد ہے میں اک دن
نیندوں کے دیار میں سپنوں کی
پریوں سے لپٹ کر سویا تھا
ہاں اتنا یاد ہے میں اک دن
گھر والوں سے اپنے لڑ بھڑ کے
توڑ آیا تھا سب رشتے ناتے

ہاں اتنا یاد ہے میں اک دن
جب بہت دکھی تھا، تنہا تھا
اک جسم کی آگ میں پگھلا تھا

ہاں یہ بھی یاد ہے میں اک دن
سچ بول کے پچھتایا تھا بہت
اپنے سے بھی شرمایا تھا بہت
ہاں یہ بھی یاد ہے مجھ کو کہ میں
جب بہت ہی بے کل ہوتا تھا
اشعار بھی لکھا کرتا تھا

ہاں یہ بھی یاد ہے مجھ کو کہ میں
روٹی روزی کی تمنا میں
بڑا خوار ہوا اس دنیا میں

ہاں اور بھی کچھ ہے یاد مجھے
مگر اس کا جواب کہاں یہ سب
یہ تیس برس کیسے گزرے
یہ تیس برس کیسے کاٹے
اب اس کے جواب سے کیا ہوگا

چلو اٹھو کہ صبح ہوئی دیکھو
چلو اٹھو کہ اپنا کام کریں
چلو اٹھو کہ شہر تمنا میں
مرہم ڈھونڈیں ان زخموں کا
جو دل نے ابھی تک کھائے نہیں
تعبیر کریں ان خوابوں کی
جو آنکھوں نے دکھلائے نہیں

ان لمحوں کے ہم راز بنیں
جو زیست میں اپنی آئے نہیں

چلو تیسواں سال بھی بیت گیا
چلو مے چھلکائیں، جشن کریں
چلو سر کو جھکائیں سجدے میں
اس عمر فرومایہ کا سفر
آدھے سے زیادہ ختم ہوا

خواب سے پہلے، خواب کے بعد

آوازیں، جو ننگے بدن بالوں کو کھولے
دروازے کی درز سے اندر گھس آئی ہیں
کھلے ہوئے آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے
پڑے ہوئے سوکھے پتوں کے زرد لبوں کو
چیخنے اور چلانے کا فن سکھا رہی ہیں
سوئے ہوئے ان کے زخموں کو جگا رہی ہیں

ایک بجا گھڑیال میں، پہرے دار کی سیٹی
دوشِ ہوا پر بیٹھ کے لمبی سیر کو نکلی
آنکھیں ملیں بلبوں نے، کوئی طائر چونکا
اک رہ گیر کو چور سمجھ کے کتا بھونکا
ماں کے کلیجے سے لپٹا اک ننھا بچہ
کسی بھیانک خواب کو دیکھ کے زور سے چیخا
دیواروں کو توڑ کے سناٹے در آئے
آدھی کھلی دو آنکھوں میں آنسو بھر آئے

عہدِ حاضر کی دل ربا مخلوق

زرد بلبوں کے بازوؤں میں اسیر
سخت، بے جان، لمبی، کالی سڑک
اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشتۂ تقدیر

بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بلیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام
ہوٹلوں سینما گھروں کے قریب
چمچماتی ہوئی نئی کاریں
اور پنواڑیوں کی دوکانیں
اور کچھ ٹولیاں فقیروں کی
'پرس' والوں کے انتظار میں ہیں

ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن
آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر
کتنے دل کش دکھائی دیتے ہیں
بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزو، غم، امید، محرومی
نیند کی گولیاں، گلاب کے پھول
کیلے، امردو، سنگترے، چاول
پینٹ، گڑیا، شمیز، چوہے دان
ایک اک شے کا کر رہی ہے حساب
عہد حاضر کی دل ربا مخلوق

خطرے کا سائرن

تمام شہر آگ کی لپیٹ میں ہے بھاگیے
حضور کب سے میٹھی نیند سو رہے ہیں جاگیے
سماں ہے روزِ حشر کا، نگاہ تو اٹھائیے
لگی ہوئی ہے آنکھ پر جو دوربیں ہٹائیے

دراز ہی میں بند رہنے دیجئے تمام خواب
کھلی ہے جو کتاب میز پر نہ بند کیجئے
اتاریئے نہ کھونٹیوں سے خواہشوں کے پیرہن
بکھر گئے ہیں فرش پر ہوائے تند و تیز سے
ورق وہ تازہ روزنامے کے بھی مت سمیٹیے
گھڑی کی سوئیوں کی سمت دیکھنے سے فائدہ

لباسِ خواب کو بدلنے کا نہیں ہے وقت اب
تمام اہلِ شہر، شہر چھوڑ کر چلے گئے
جھکے ہوئے ہیں سر عظیم بلڈنگوں کے دیکھیے
اب اور کچھ نہ دیکھیے، اب اور کچھ نہ سوچیے
تمام شہر آگ کی لپیٹ میں ہے بھاگیے

نئے عہد کا نیا سوال

یہ بات روزِ ازل سے طے ہے
زمین جسموں کا بوجھ اٹھائے گی
آسماں پر رہیں گی روحیں
مگر کوئی ہے جو یہ بتائے
ہماری پرچھائیوں کی قبریں
کہاں بنیں گی؟

انسان یا بت

ہاتھوں میں نہیں حرکت کوئی
محروم ہیں گویائی سے لب
آنکھوں کو دید کی تاب نہیں
انکار ہے دل کو دھڑکنے سے
اور گوش، سماعت سے خائف
چھو کر تو ذرا دیکھو اس کو
انسان ہے یا ہے بت کوئی

ایک اداس رات

تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں
حصار تنہائیوں کا توڑا
ہوا میں کچھ رنگ سے اڑائے
خلا میں کچھ دائرے بنائے
کسی کی زلفوں کے خم سنوارے
کسی کے چہرے کے دھندلے دھندلے
نقوش مہتاب میں ابھارے
اُدھر کسی آب جو کو چھیڑا
اِدھر کسی شاخ کو ہلایا
یہاں وہاں کچھ چراغ رکھے
تمام شب غمگساریاں کیں
تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں

پہلے صفحے کی پہلی سرخی

ہمالیہ کی بلند چوٹی پہ
برف کے ایک سبک مکاں میں
بجھی ہوئی مشعلوں کا جلسہ
عظیم اور عالمی مسائل پہ
ایک ہفتے سے ہو رہا ہے
صفر تلک درجۂ حرارت پہنچ چکا ہے
مزید تفصیل راز میں ہے

رات، دن اور پھر رات

رات کی زد سے بھاگتا ہوا دن
پہلے ٹھہرا گھنے درختوں پر
پھر لگائی زمیں پہ اس نے جست
مندروں، مسجدوں سے ٹکرایا
راستوں، کوچوں اور گلیوں کی
گرد اور گندگی سے بچتا ہوا
گھس گیا تنگ خالی کمروں میں
تیز رفتار بس میں ہو کے سوار
پھر گیا اونچی بلڈنگوں کی طرف
بوسے کچھ فائلوں پر ثبت کیے
کچھ درازوں کے جسم سہلائے
پھر چلا کافی ہاؤس کی جانب

پھر ملوں کے دھوئیں کے سیل کے ساتھ
ان فلک بوس چوٹیوں پہ گیا
پھر کسی سخت شے سے ٹکرایا
اور پھر رات، ہر طرف ہی رات

بے ثبات تغیر

لکیریں، دائرے، دھبے، نقوش پا
مری آنکھوں کے دروازوں سے
میرے جسم کے اندر اتر جاتے ہیں
خوں بن کر رگوں میں رقص کرتے ہیں
کبھی دو پل، کبھی اک شب، کبھی کچھ دن
اور اس کے بعد آنسو بن کے
آنکھوں ہی کے دروازوں سے
میرے جسم سے باہر نکلتے ہیں
زمیں پر گرتے گرتے، دیکھتے ہی دیکھتے
بن جاتے ہیں پھر سے
لکیریں، دائرے، دھبے، نقوشِ پا

افتاد

دیکھتے دیکھتے چپ ہو گئے سب
وہ بھی، جو نیند کی شبنم میں نہا کر
کسی نادیدہ حسیں شکل کے دیدار کی لذت کے بھجن گاتے تھے
وہ بھی جو آنکھوں کے طاقوں میں چراغاں کر کے
چیختے تھے، کبھی روتے تھے، کبھی ہنستے تھے
وہ بھی، جو زخموں کے پھولوں میں لدے
آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے کرتے تھے دعا
کیسی افتاد پڑی آخرِ شب
دیکھتے دیکھتے چپ ہو گئے سب

ایک بوند خون کی

فضا میں آہٹوں کے رنگ اڑ رہے ہیں جابجا
ہوا ہر اک درخت کو جگا رہی ہے نیند سے
نگاہ دوریوں کا سحر توڑنے پہ ہے بہ ضد
لبوں سے استوار ہو رہا ہے رشتۂ صدا
رگِ گلو میں چبھ رہی ہے ایک بوند خون کی

نئی کہانی

یہ کہانی سنی نہ ہوگی کبھی
یہ فسانہ پڑھا نہ ہوگا کہیں

صبح کی آرزو میں ساری رات
سرخ، نیلے، ہرے، سیاہ، پتنگ
شمع کے گرد رقص کرتے رہے
اور سلامت رہے سبھی کے سر
اور سلامت رہے سبھی کے پر
اور سجل اور سبک، سفید سفید
موم کے مقبرے رہے خالی
اور اس بے مثال منظر کو
صرف دو آنکھیں دیکھنے والی

فرار

رات کا بیتنا، دن کا آنا
کون سی ایسی نئی بات ہے
جس پر ہم سب
اتنے افسردہ ہیں
کھڑکی کھولو
اس طرف سامنے دیکھو
وہ کھڑی ہے چھت پر

تنبیہ

وہ جو آسماں پہ ستارہ ہے
اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو
اسے اپنے ہونٹوں سے چوم لو
اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ لو
کہ اسی پہ حملہ ہے رات کا

زندگی کی خواہش

ابھی بوتلوں کے بدن میں تھی
ابھی اک گلاس کی تہہ میں تھی
ابھی قطرہ قطرہ لرز رہی تھی
لبوں کی زرد منڈیر پر
ابھی حلق میں، ابھی دل میں تھی
ابھی، ہاں ابھی ابھی، بس ابھی
کسی ریگ زار میں کھو گئی

ایک اور پیشن گوئی

پھر گھنے پیڑوں سے اڑیں گے طیور
پھر بجائیں گے تالیاں پتے
ٹہنیاں پھر لڑیں گی آپس میں
کونپلوں کے شہید جسموں کو
منتشر پھر کرے گی موج ہوا

غیبی صدا

وہ سورج ڈوب کر شاید نہ ابھرے
دیکھ لو جی بھر کے اس کو
اور چھپا لو اپنی آنکھوں میں
ذرا سی روشنی، کچھ خواب، اک چہرہ
یہاں سے آگے، سنتے ہیں
بہت پر ہول اور تاریک صحرا ہے

اسٹل لائف

پھول، پتیاں، شاخیں
ہونٹ، ہاتھ اور آنکھیں
موجِ خوں، صدائے دل
ماہتاب اور سورج
منجمد ہیں سب کے سب
وقت کی کماں میں اب
تیر ہی نہیں کوئی

دھند کی حکومت

وہ صلیب کا سایہ
اب نظر نہیں آتا
وہ نحیف سا نقطہ
اب ہوا میں لرزاں ہے
وہ ادھوری پرچھائیں
اپنے سے پشیماں ہے
وہ بھٹکتا سناٹا
بے لباس و عریاں ہے
اب تو اس افق پر بھی
دھند کی حکومت ہے
اب تو بند لب کھولو
اب تو چیخ کر رو لو

ابھی سے

ابھی تو رنگ کی اڑان
سرحدِ نظر میں ہے
ابھی تو نور لازوال
دل کی رہ گذر میں ہے
ابھی تو روح بے قرار
جسم کے سفر میں ہے
ابھی سے آئینے تمام
ٹوٹ کر بکھر گئے
ابھی سے خوف کے مہیب
دیوتا بپھر گئے

رات

تمام سورجوں کو دفن کر کے اپنے ہاتھ سے
ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے آن بان سے
وہ آ رہی ہے آسماں پہ اپنا جھنڈا گاڑ کے
وہ آ رہی ہے آہنی بلندیاں پھلانگ کے
کہانیوں کے دیو بھی نہ رات کو ڈرا سکے

ایک نظم

مائل بہ کرم ہیں راتیں
آنکھوں سے کہو اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں

سوچو پھر سے

تم لکیروں کو جہاں ملتے ہوئے دیکھتے ہو
وہ خلا ہے
وہاں کچھ بھی نہیں
سوچو پھر سے
کون سی آنکھیں تھیں، کس کے لب تھے
ریشمی ہاتھوں کے مبہم سے اشارے کیا تھے
کس طرف سے وہ صدا آئی تھی
کس سمت تمھیں جانا تھا

بے بسی

جسم کے قہر کی فریادی ہے روح تنہائی
پھر بھی آنکھوں میں مری دور تلک
نیند کی پرچھائیں نہیں
اور افق دھند کا زندانی ہے
اور سناٹوں کی سرگوشیاں
تلواریں لیے
صف بہ صف بڑھتی چلی آتی ہیں دل کی جانب
دھڑکنیں چھیننے، سانسوں کا گلا کاٹنے کو
ہونٹ اس سمت ہیں، آنکھیں ہیں اُدھر
ہاتھ ادھر
،ور میں ہل نہیں سکتا ذرا اپنی جا سے
بچ کے جاؤں گا کہاں رات کے اس صحرا سے

بند کمرے میں مقید روشنی

بند کمرے میں مقید روشنی
کارنس کو، کرسیوں کو، میز کو
دھندلی تصویروں کو، کالے شیلف کو
اپنے بوسوں سے جگاتی ہے مگر
کوئی بھی آمادۂ جنبش نہیں
ہاں بھٹکتے پھر رہے ہیں جابجا
آج کے اخبار کے اوراق کچھ

منظرِ خوب

گردن میں نقوشِ پا کی
ڈالے ہوئے ننھی باہیں
بھرتے ہیں بگولے آہیں
کچھ دور پہ اک پرچھائیں
سورج کے ستم کی شاکی
تکتی ہے راہ فنا کی
اور سارے شجر خائف ہیں
تلوار سے تیز ہوا کی
صدیوں سے لہو روتی ہیں
اس منظرِ خوب پہ آنکھیں

اک پل میں

اک پل میں فضائے دیدہ ودل بے رنگ ہوئی
اس شکل کے سارے نقوش فنا کی نذر ہوئے
اس جسم کی آگ بھی سرد ہوئی
وہ خوش بو، وہ شبنم، وہ دھیمی سرگوشی
اک اک کر کے سب ختم ہوئے
اک پل میں فضائے دیدہ ودل بے رنگ ہوئی

تشخیص

بے پیکر خوشبو کے ساتھ بھٹکتے ہو
اور شکایت کرتے ہو تنہائی کی
تم ناداں ہو جینا تم کو نہیں آتا
اس سے زیادہ نہ کچھ کہیں گے لب میرے

نیا افق

کیا تم کو یہ پتہ ہے
اے ناسمجھ رفیقو!
روزِ ازل سے جس پر
تم گامزن رہے ہو
وہ راستہ خلا کی
سرحد سے جا ملا ہے

مشعل جلاؤ، دیکھو
بپھری ہوئی ہوا میں
آئینۂ صدا میں
چہرہ کسی افق کا
پھر سے ابھر رہا ہے

خوابِ حسین کے وارثوں سے

میں مانتا ہوں
تم خوابِ حسین کے وارث ہو
میں جانتا ہوں
تم پیاس کی شدت میں بھی سراب کو دریا نہیں کہنے والے
تسلیم مجھے
جس رہ میں نشیب و فراز نہیں
وہ راہ جنوں کی راہ نہیں
یہ راز مگر بتلاؤ مجھے
تلوار کا سایہ سر کی بلندی کے درپے ہے
کوفۂ زیست میں قطرۂ آب امید نہیں ہے
پھر بھی شہادت کے اعزاز کے لائق تم میں کوئی نہیں ہے

اعتراف

وہ دور بلند پہاڑوں پر
ملبوس فرشتوں کا پہنے
خوابوں کے مہیب درختوں کی
شاخوں پر جھولا ڈالے ہوئے
پرچھائیاں چھوٹی بڑی لاکھوں
مصروف ہیں زخم شماری میں

میں ایک نحیف سے نقطے کی
باہوں میں اسیر تڑپتا ہوں
ہموار زمیں پر چلنے کی
خواہش کے عذاب میں جلتا ہوں

فسادات کی زبان سے

بے حسی کے صحرا میں
خوں کو جذب کرنے کی
اب سکت نہیں باقی

روزناموں کے چہرے
اس خبر کی سرخی سے
کب سجائے جائیں گے

روز صبح کو سورج
چیخ چیخ کر مجھ سے
یہ سوال کرتا ہے

ایک سیاسی نظم

مگر بے ذائقہ ہونٹوں سے
تم نے سخت چٹانوں کو چوما تھا
وہ ان کی کھردراہٹ، نوک نکلی چھاتیاں
تیزابیت، نمکین کائی
سب کی لذت سے رہے نا آشنا بچے تمھارے
اسی باعث تو ان کے جسم میں خوں کی جگہ پانی کی گردش ہے
اسی باعث وہ اپنی نفرتوں کے خود ہدف ہیں
اور دشمن ان پہ ہنستے ہیں

پچھتاوا

چاند کے جسم کا آدھا سایہ
دشت کے دل کا بگولہ کوئی
یا وہی تیز ہوا کا جھونکا
کوئی تورات کی دیوار گرانے آتا

میں نے بھٹکی ہوئی آوازوں کو
خودکشی کرنے سے روکا بے کار
سبز اشجار پہ سورج کی برہنہ کرنیں
آج پھر ناچیں گی، گائیں گی
اسی صورت سے
دن کی نفرت کا ہدف صرف مرا سایہ نہیں
میری آواز بھی ہے
میں نے بھٹکی ہوئی آوازوں کو
خودکشی کرنے سے روکا بے کار

ایک نظم

ہوا کی زد میں چراغ امید کب نہیں تھا
مگر یہ ہاتھوں کی کپکپاہٹ
لبوں پر ریگ سکوت
آنکھوں میں آنسوؤں کے امنڈتے دریا
تم اپنے آبا کے کارناموں سے بے خبر ہو
حسین ابن علی کے وارث
شہید ہوتے ہیں کربلا میں

پشیمانی کا کرب

جب ہوا کی لکیر کے ہم راہ
یاں سے گزرے گی بازگشت صدا
اک اکیلی اداس پرچھائیں
دشت بے آرزو سے ہوگی طلوع
بے افق آسمان کی جانب
ہاتھ اٹھائے گی اور کرے گی دعا

اے خداوند، اے رحیم و کریم
میں پشیمان ہوں کہ ہاں میں نے

ایک دن جسم سے بغاوت کی
اب سزا مل چکی ہے مجھ کو بہت
جسم کوئی مجھے دوبارہ دے

غزلیں

○○○

وحشت میری کتنی راس آئی مجھ کو
اک عالم کی سیر کرا لائی مجھ کو

میں جینے سے باز نہ آؤں گا یارو!
دیوانہ سمجھو یا سودائی مجھ کو

شہرت کے اس سحر سے جلد نجات ملے
ڈھونڈھ رہی ہے کب سے رسوائی مجھ کو

بزم ناز سے خالی ہاتھ اٹھوں کیسے
مل جائے تھوڑی سی تنہائی مجھ کو

تیرا بدل کہہ سکتیں جس کو یہ آنکھیں
خوابوں نے وہ شکل نہ دکھلائی مجھ کو

○○○

کس کس طرح سے مجھ کو نہ رسوا کیا گیا
غیروں کا نام میرے لہو سے لکھا گیا

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آ گیا

کیوں آج اس کا ذکر مجھے خوش نہ کر سکا
کیوں آج اس کا نام مرا دل دکھا گیا

میں جسم کے حصار میں محصور ہوں ابھی
وہ روح کی حدوں سے بھی آگے چلا گیا

اس حادثے کو سن کے کرے گا یقیں کوئی
سورج کو ایک جھونکا ہوا کا بجھا گیا

○○○

جہاں پہ تیری کمی بھی نہ ہوسکے محسوس
تلاش ہی رہی آنکھوں کو ایسے منظر کی

ہمیں تو خود نہیں معلوم کیا کسی کو بتائیں
کہ تجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیوں بچھڑ کر کی

کہاں پہ دفن وہ پرچھائیاں کریں یارو
جو تاب لا نہ سکیں روشنی کے خنجر کی

ہر ایک گل کو ہے عشق سموم کا سودا
ہر ایک شاخ یہاں معتقد ہے صرصر کی

مگر یہ ذوق پرستش کہ اب بھی تشنہ ہے
جبیں کو چوم چکے ایک ایک پتھر کی

جدھر اندھیرا ہے، تنہائی ہے، اداسی ہے
سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی

○○○

چھائے ہوئے تھے بادل لیکن برسے نہیں
درد بہت تھا دل میں مگر ہم روئے نہیں

کوئی نہیں جو ہم سے اتنا بھی پوچھے
جاگ رہے ہو کس کے لیے کیوں سوئے نہیں

دکھ ہے اکیلے پن کا مگر یہ ناز بھی ہے
بھیڑ میں اب تک انسانوں کی کھوئے نہیں

اپنی نظر میں خود کو سبک ہم نے نہ کیا
یعنی کسی کی راہ میں کانٹے بوئے نہیں

○○○

اس حصارِ روز و شب سے دوستو نکلو ذرا
دیکھ لی دنیا بہت اب خود کو بھی دیکھو ذرا

جس طرف بھی جائیے تنہائیوں کی گرد ہے
شہرِ دل میں یک بہ یک کیا ہوگیا سوچو ذرا

سائے پھر سائے ہیں ڈھل جائیں گے یہ سورج کے ساتھ
یہ حقیقت تلخ ہے لیکن اسے سمجھو ذرا

کونپلیں زخموں کی پھر مرجھا گئیں اہلِ جنوں
آؤ شاخِ آرزو کو خوں سے پھر سینچو ذرا

آنسوؤں کا سیل ہر شے کو بہالے جائے گا
جس طرح بھی بن پڑے اس سیل کو روکو ذرا

○○○

اس کو سر آنکھوں پر بٹھاؤں نہ کیوں
بوئے گل ہے سفیرِ شہرِ جنوں

میرا سرمایہ ہے مری وحشت
میری دولت ہے میرا سوزِ دروں

میں اکیلا سہی مگر کیسے
ننگی پرچھائیوں کے بیچ رہوں

اور سب کچھ کیا یہی نہ ہوا
جھوٹی باتوں سے خوش کسی کو کروں

ہاتھ کٹ جائیں، سر قلم ہو جائے
پرچمِ اہلِ درد ہو نہ نگوں

کر چکا ہوں حساب سب کا صاف
زندگی کا بھی قرض اتار ہی دوں

دل دکھے گا بہت سے لوگوں کا
قصۂ شوق میں لکھوں نہ لکھوں

○○○

کہنے کو تو ہر بات کہی تیرے مقابل
لیکن وہ فسانہ جو مرے دل پہ رقم ہے

محرومی کا احساس مجھے کس لیے ہوتا
حاصل ہے جو مجھ کو کہاں دنیا کو بہم ہے

یا تجھ سے بچھڑنے کا نہیں حوصلہ مجھ میں
یا تیرے تغافل میں بھی اندازِ کرم ہے

تھوڑی سی جگہ مجھ کو بھی مل جائے کہیں پر
وحشت ترے کوچے میں مرے شہر سے کم ہے

اے ہم سفرو ٹوٹے نہ سانسوں کا تسلسل
یہ قافلۂ شوق بہت تیز قدم ہے

OOO

زمیں سے تا بہ فلک دھند کی خدائی ہے
ہوائے شہر جنوں کیا پیام لائی ہے

پیا ہے زہر بھی آب حیات بھی لیکن
کسی نے تشنگی جسم و جاں بجھائی ہے؟

یہ کوئی ضد ہے کہ ہے رسم عاشقی ہی یہی
ہوا کے رخ پہ جو شمع وفا جلائی ہے

یہ کم نہیں کہ طرف دار ہیں مرے کچھ لوگ
ہنر کی ورنہ یہاں کس نے داد پائی ہے

مسافران رہ شوق اور تیز قدم
کہ چند گام ہی اب منزل جدائی ہے

○○○

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے آج
یہ الگ بات کہ شکوہ کیا تنہا ہم نے

خود پشیمان ہوئے، نے اسے شرمندہ کیا
عشق کی وضع کو کیا خوب نبھایا ہم نے

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

عمر بھر سچ ہی کہا، سچ کے سوا کچھ نہ کہا
اجر کیا اس کا ملے گا یہ نہ سوچا ہم نے

○○○

آندھی کی زد میں شمع تمنا جلائی جائے
جس طرح بھی ہو لاج جنوں کی بچائی جائے

بے آب و بے گیاہ ہے یہ دل کا دشت بھی
اک نہر آنسوؤں کی یہاں بھی بہائی جائے

عاجز ہیں اپنے طالع بیدار سے بہت
ہر رات ہم کو کوئی کہانی سنائی جائے

سب کچھ بدل گیا ہے مگر لوگ ہیں بضد
مہتاب ہی میں صورت جاناں دکھائی جائے

کچھ ساغروں میں زہر ہے کچھ میں شراب ہے
یہ مسئلہ ہے تشنگی کس سے بجھائی جائے

شہروں کی سرحدوں پہ ہے صحراؤں کا ہجوم
کیا ماجرا ہے آؤ خبر تو لگائی جائے

نازل ہو جسم و روح پہ جب بے حسی کا قہر
اس وقت دوستو یہ غزل گنگنائی جائے

○○○

کب ہوا دنیا میں ایسا حادثہ
معتقد ہے بادِ صرصر کی صبا

دھند کی زد میں ہے خوابوں کا افق
دیکھیے دکھلائیں آنکھیں اور کیا

ڈھل گئی کیوں عارضوں کی چاندنی
کھل گئی کب گرم سانسوں کی گھٹا

ساعتوں کے پیچ و خم کے بعد بھی
قرب کا انجام دوری ہی رہا

کھو گئے سارے مسافر یاد کے
ہو گیا ویران دل کا راستہ

بجھ گیا آخر چراغِ آرزو
وار کاری تھا ہوا کے ہاتھ کا

○○○

آنکھوں سے خوں چھلکتا رہا دل دُکھا رہا
اور اس پہ بھی کسی سے نہ مجھ کو گلا رہا

یا عشق تھا اداسی و تنہائی سے مجھے
یا وقت ایک موڑ پہ صدیوں رکا رہا

کیا رات شہر درد میں آئی نہ تھی ہوا
کیوں چاند تیرگی کے بھنور میں پھنسا رہا

سب ہمسفر شہید ہوئے راہ شوق میں
پرچھائیوں کے وار سے اک میں بچا رہا

دل کے ورق پہ لکھا تھا جو کچھ سو مٹ گیا
لیکن جبیں پہ جو بھی لکھا تھا لکھا رہا

○○○

بنیاد جہاں میں کجی کیوں ہے
ہر شے میں کسی کی کمی کیوں ہے

کیوں چہرۂ خار شگفتہ ہے
اور شاخِ گلاب جھکی کیوں ہے

وہ وصل کا دن کیوں چھوٹا تھا
یہ ہجر کی رات بڑی کیوں ہے

جس بات سے دل میں ہلچل ہے
وہ بات لبوں پہ رکی کیوں ہے

مت دیکھ کہ کون ہے پروانہ
یہ سوچ کہ شمع جلی کیوں ہے

نہ تھے خواب تو آنسو ہی ہوتے
مرا کاسۂ چشم تہی کیوں ہے

○○○

زندگانی کا تقاضا ہے یہ اہلِ دہر سے
مے سے ہو خالی اگر ساغر تو بھر لو زہر سے

منعقد جلسے کرو یا محفلیں برپا کرو
بچ نہ پاؤ گے مگر تنہائیوں کے قہر سے

عافیت، آوارگی کا فرق مٹ جائے گا اب
سرحدیں صحراؤں کی ملنے لگی ہیں شہر سے

آج ان پیڑوں کا سایہ ہو گیا ہم پر حرام
کل جنھیں سینچا تھا ہم نے آنسوؤں کی نہر سے

○○○

شبِ غم کیا کریں کیسے گزاریں
کسے آواز دیں، کس کو پکاریں

سرِ بامِ تمنا کچھ نہیں ہے
کسے آنکھوں سے اس دل میں اتاریں

وہی مبہم سی سرگوشی ہوا کی
وہی افسردہ شمعوں کی قطاریں

وہی دھندلے سے ننھے ننھے سائے
وہی سونی سسکتی رہگذاریں

کہاں تک یادِ غم خواری کرے گی
کہاں تک زلفِ تنہائی سنواریں

مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے
خلا میں اک نیا چہرہ ابھاریں

اٹھو نیندوں سے آنکھوں کو جلائیں
چلو خوابوں کی پریوں کو پکاریں

○○○

صدائے درد پہ نازاں ہوں وہم کیا ہے مجھے
سکوت سنگ سے ٹکرا کے کیا ملا ہے مجھے

ہر ایک جسم کو سایہ بھی کب میسر ہے
یہ امتیاز خدا نے مگر دیا ہے مجھے

سوائے تیرے کوئی میرا رازدار نہیں
جہاں میں یوں تو ہر اک شخص جانتا ہے مجھے

بھٹکتا پھرتا ہوں مثل ہوائے آوارہ
کسی کی زلف سے کہنے کو سلسلہ ہے مجھے

○○○

صدائے دل کا یہ احسان مجھ پہ تھوڑا ہے
میں سو رہا تھا مجھے نیند سے جھنجھوڑا ہے

خفا ہے ایک جہاں اہلِ شوق سے یارو
رخِ حیات نئی سمت کو جو موڑا ہے

کسی افق پہ نہ جب روشنی نظر آئی
مری نگاہ نے رشتہ خلا سے جوڑا ہے

ابھی سے مجھ کو رقیبوں میں اپنے گننے لگے
ابھی تو میں نے خموشی کا سحر توڑا ہے

○○○

مانا کہ دھوپ سخت ہے، میں سر برہنہ ہوں
بے حس شجر کے سائے میں کیسے پناہ لوں

بے نشۂ امید تو ہر لحہ ہے عذاب
ضد کر رہی ہے زیست کہ میں اور بھی جیوں

چلتا ہوں ریگزارِ تمنا میں بے سراب
اس سادگی پہ اپنی نہ روؤں تو کیا ہنسوں

سناٹے صف بہ صف بڑھے آتے ہیں میری سمت
اے دل کی دھڑکنو! کہو کس طرح سے بچوں

سارے چراغ بجھ گئے، سب نقش مٹ گئے
پھر بھی سفرِ حیات کا جاری ہے کیا کروں

کچھ دور پر بگولوں کی افواج ہیں کھڑی
کوئی بھی شہر میں نہیں کس کو خبر یہ دوں

○○○

یہ اک شجر کہ جس پہ نہ کانٹا نہ پھول ہے
سائے میں اس کے بیٹھ کے رونا فضول ہے

راتوں سے روشنی کی طلب، ہائے سادگی
خوابوں میں اس کی دید کی خو کیسی بھول ہے

ہے ان کے دم قدم ہی سے کچھ آبروئے زیست
دامن میں جن کے دشت تمنا کی دھول ہے

سورج کا قہر صرف برہنہ سروں پہ ہے
پوچھو ہوس پرست سے وہ کیوں ملول ہے

آؤ ہوا کے ہاتھ کی تلوار چوم لیں
اب بزدلوں کی فوج سے لڑنا فضول ہے

○○○

خائف کتنی تنہائی کے عذاب سے تھی
میری زیست کو نسبت جب تک خواب سے تھی

بجھ ہی گیا وہ دل کا داغ بھی آخر کار
روشنی ہجر کی شب میں جس مہتاب سے تھی

اس کو قریب سے دیکھ لیا تو کچھ نہ رہا
ساری کشش اس حسن میں ایک نقاب سے تھی

دریا دیکھ کے پیاس کو اپنی بھول گئے
تشنہ لبی وابستہ جن کی سراب سے تھی

○○○

معبدِ زیست میں بت کی مثال جڑے ہوں گے
یہ ننھے بچے جس روز بڑے ہوں گے

اتنے دکھی، اس درجہ اداس جو سائے ہیں
رات کے دشت میں تیز ہوا سے لڑے ہوں گے

دھوپ کے قہر کی لذت کے شیدائی ہیں
یہ اشجار بھی خواب سے چونک پڑے ہوں گے

ہم کو خلا کی وسعت سے فرصت نہ ملی
لاکھ خزانے اس دھرتی میں گڑے ہوں گے

وہ دن ہوگا آخری دن ہم سب کے لیے
آئینہ دیکھنے جب ہم لوگ کھڑے ہوں گے

○○○

خوش بو کا جسم سائے کا پیکر نظر تو آئے
دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ منظر نظر تو آئے

اہلِ وفا کو شوق شہادت ہے آج بھی
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر نظر تو آئے

پھر چھوڑ دیں گے یہ بھی تعاقب سراب کا
تشنہ لبوں کو کوئی سمندر نظر تو آئے

آنکھیں خلا کی دھند سے آگے کریں سفر
اک نور کی لکیر افق پر نظر تو آئے

دو چار دن سکون سے ہم بھی گزار لیں
اس دشتِ بے کراں میں کوئی گھر نظر تو آئے

○○○

طلسم ختم چلو آہ بے اثر کا ہوا
وہ دیکھو جسم برہنہ ہر اک شجر کا ہوا

سناؤں کیسے کہ سورج کی زد میں ہیں سب لوگ
جو حال رات کو پرچھائیوں کے گھر کا ہوا

صدا کے سائے میں سناٹوں کو پناہ ملی
عجب کہ شہر میں چرچا نہ اس خبر کا ہوا

خلا کی دھند ہی آنکھوں پہ مہرباں رہی
حریف کوئی افق کب مری نظر کا ہوا

میں سوچتا ہوں مگر یاد کچھ نہیں آتا
کہ اختتام کہاں خواب کے سفر کا ہوا

نثری نظمیں

(۱)

کھٹے انگوروں کے خوشوں میں
دانت گڑونے اور ان کی ترشی سے
اپنے ہونٹوں پر جمی ہوئی
تہہ بہ تہہ راکھ کے ذائقے کو
زائل کرنے کی ایک ادنیٰ سی خواہش
خون بن کر رگوں میں دوڑتے دوڑتے
ہانپنے لگی ہے، تھکنے لگی ہے

وہ سخت سی، ٹھوس سی، سفید سی
شے کہاں ہے
جس کو چھونے سے مردے زندہ ہو جاتے ہیں
میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں

(۲)

بارش تھمنے والی ہے
بادل اپنے پروں کو سمیٹ رہے ہیں
ہوش میں آؤ
سانسوں میں ہمواری پیدا کرو
وہ مختصر لمحہ جاچکا ہے
اور طویل و بے حس دن
اس کی جگہ لینے والا ہے

(۳)

رات لمبی اور کالی ہے
نرم اور نم گھاس
سخت اور خشک سرسراہٹ کی منتظر ہے
خامشی آہٹ کی منتظر ہے

(۴)

ان دو گنبدوں کو ہاتھوں سے ٹٹولو
اور ہونٹوں سے چومو
ان میں گرم سانسیں،
بھینی خوش بوئیں،
مدھم سسکیاں
کبھی قریب آتی ہوئی، کبھی دور جاتی ہوئی
سرگوشیاں قید ہیں
ان دو گنبدوں کو توڑو
اور ان سب کو آزاد کرو

(۵)

یہاں نہیں
پتھریلی دیواروں میں سوراخ کرتی ہوئی
اس طرف چلو
ادھر، وہاں
جہاں ریت کے گرم اور تندرو دریا سے
جھاگ اٹھ رہے ہیں
اور اجنبی قدموں کے نشان
ڈوب جانے کے خوف سے
چلا چلا کر
ہمیں اور تمھیں پکار رہے ہیں
بہت دیر سے پکار رہے ہیں
ملبوس کی شکنوں،
بوجھل پلکوں پر جگ مگ جگ مگ کرتے
آنسوؤں کو
اور ہمارے تھکے ہوئے جسموں کو
دیکھنے والا وہاں کوئی نہیں ہے

یہاں نہیں،
ادھر چلو
وہ ہمیں پکار رہے ہیں
بہت دیر سے پکار رہے ہیں

(۶)

وہ ابھی دور ہے اور سایہ ہے
اس کے قریب جاؤ
یا اسے اپنے پاس بلاؤ
اس کو ایسی شکل دو
جو تمھیں پسند ہو
اس کو ایسا جسم دو
جس میں آگ ہی آگ ہو
جو تمھیں پگھلا دے، جلا دے
اور دنیا کے لیے تمھیں یادگار بنا دے

اس کو ایسی روح دو
جو اذیتوں اور دکھوں کے
بوجھ اٹھا سکے

جو بغیر جسم کی بیساکھی کے
موت کی منزل تک جا سکے
وہ ابھی دور ہے اور سایہ ہے
اس کے قریب جاؤ یا اسے اپنے پاس بلاؤ

(۷)

کیا تمھیں یاد ہے
تم نے رات کے ہاتھ پر قسم کھائی تھی
کہ صبح کے سورج کی تلوار کی چمک
اور کاٹ سے
تم خوف زدہ نہیں ہو گے
اور اپنی آنکھوں میں
تم نے خوابوں کے جو خزانے چھپا رکھے ہیں
انھیں کسی ایسے آدمی کو
بہ طور تحفہ دے دو گے
جو تم سے زیادہ
بلند حوصلہ، نڈر اور جری ہو
تو اب کیا سوچتے ہو

(۸)

دریا کی سطح کا سکون ایک فریب ہے
نیچے تہہ میں دیکھو
موجیں بپھر بپھر کر
ایک دوسرے پر حملہ کر رہی ہیں
اور اپنی نفرتوں کی آگ میں جل رہی ہیں
اور اس طرح
اپنے وجود کا اثبات کر رہی ہیں

(۹)

محبت کا دعویٰ کرنا بے کار ہے
کہ اس کا مفہوم تم خود نہیں جانتے
اور شاید کبھی جان بھی نہ پاؤ
تمھاری پہچان
صرف تمھاری نفرتوں سے ہو سکتی ہے
تو بتاؤ
تم کو کس کس سے اور کتنی نفرت ہے
کہ ہم تمھارے وجود کو کوئی نام دے سکیں

(۱۰)

برہمی کا اظہار

آنسوؤں اور آہوں سے نہیں ہوتا

دوسروں کو برا ثابت کرنے کی

سب کوششیں رائگاں جائیں گی

کہ تم نے اپنی نفرتوں کی

مناسب نگہ داشت نہیں کی

اسی لیے تم بے حس ہو

اور آنسوؤں اور آہوں کے سہارے

دوسروں سے رحم طلب کرتے ہو

اس طرح

تم اپنی برہمی کا اظہار نہیں کرتے

بلکہ اسے چھپاتے ہو

(۱۱)

ہر مرد و زن کو معلوم ہو کہ
ہم نے ہوا کا قالب اختیار کر لیا ہے
ہم پیڑوں، پہاڑوں اور آسمانوں پر
ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہیں
ہم اس آگ کی روشنی کی ضمانت ہیں
جو جنت سے چرائی گئی تھی
اور زمین پر لائی گئی تھی
ہر مرد و زن کو معلوم ہو کہ
ہم آج کے نوجوان ہیں
ہم نے ہوا کا قالب اختیار کر لیا ہے

(۱۲)

تمھاری تلوار زنگ آلود ہے
اس لیے کہ تم نے اسے کبھی استعمال نہیں کیا
اور استعمال کرتے بھی تو کیسے
تم اپنے دشمنوں سے ناواقف تھے
تم تو صرف اتنا جانتے تھے کہ
تمھارے پاس ایک چمکتی ہوئی تلوار ہے
جو جرأت اور بہادری کی نشانی ہے
لیکن تم یہ نہیں جانتے تھے کہ
تلوار کی چمک خون سے قائم رہتی ہے
اور خون بھی دشمن کا، دوست کا نہیں
لیکن تم اپنے دشمنوں سے ناواقف تھے
اسی لیے تمھاری تلوار زنگ آلود ہے

(۱۴)

کیا تم کو شرم نہیں آتی
تم اپنے بچوں کی مدافعت کے محتاج ہو
تم ان کے دست و بازو کی طاقت
اپنے آرام اور حفاظت کے لیے
استعمال کرنا چاہتے ہو
کیا تمھیں معلوم نہیں
کہ پہلے زمانوں میں بوڑھے اور بزرگ
بچوں کی مدافعت اور حفاظت کیا کرتے تھے
تم نے اپنے بچوں سے کبھی محبت نہیں کی
اور ان کے دشمنوں سے کبھی نفرت نہیں کی
اور اس کے بعد بھی تم ان سے وہ کچھ
چاہتے ہو
جو تم نے اپنے بزرگوں کے لیے نہیں کیا
کیا تم کو شرم نہیں آتی

(۱۴)

ہم تمھاری طرح نادان نہیں ہیں
اپنی نفرتوں سے پشیمان نہیں ہیں
بلکہ ہم کو ان پر ناز ہے
یہی نہیں
ہم اپنے وجود کی پہچان کے لیے
اپنی نفرتوں کے مشکور ہیں
ہم نے اپنی نفرتوں کو
اپنے اندر چھپے ہوئے خوف کا خون
پلا پلا کر جوان کیا ہے
ہم تمھاری طرح نادان نہیں ہیں
اپنی نفرتوں سے پشیمان نہیں ہیں

(۱۵)

تمھارا شعلہ بجھ چکا ہے
اس لیے نہیں کہ ہوا تیز تھی اور مخالف تھی
بلکہ اس لیے کہ تم نے
اسے ہوا سے دور رکھا
اب تم ایک بے جان، بے روح پیکر ہو
(جو سائے سے محروم ہے)
تم رات کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے
اور دن تم سے نفرت کرتا ہے
زمین سے تمھارا رشتہ ختم ہو چکا ہے
خدا سے فریاد کرو
اور دعا کرو کہ
وہ تمھیں ابدی سکون سے ہم کنار کرے

حرف تازہ

نجمہ شہریار کے نام

نظمیں

وجود کا حصہ

سورج کی بے مہر صدا نے
یخ بستہ پتھریلی ہوا نے
نیند کی شبنم کی چادر کو
میرے جسم سے جب سرکایا
تو یہ راز سمجھ میں آیا

اس کی سڈول لچکتی باہیں
اس کی گھٹتی بڑھتی سانسیں
اس کی اداس سمندر آنکھیں
اس کی طویل چیختی آہیں
میرے وجود کا ایک حصہ ہیں

میری زمیں

زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدی کی صورت
ریگ کے سیل میں ایک بگولہ
ہانپ رہا ہے
اپنے وجود سے خوف زدہ ہے

گردوغبار خواب سے
دھند کا ننھا نقطہ پھیل رہا ہے
اور افق اس کی زد میں ہے

میری آنکھیں دشت خلا میں
نور کی ایک لکیر کو بنتا دیکھ رہی ہیں
لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں
میری زمیں کس کی حد میں ہے

گم شدہ

کھردرے جسم کے نشیب و فراز
جاننے کی ہوس میں جس کی زباں
اور سب ذائقے بھلا بیٹھی
وہ نہتا، اکیلا، رات کے وقت
ایک دل دوز چیخ کے ہمراہ
جنگلوں کی طرف گیا تھا کبھی
اور پھر لوٹ کر نہیں آیا
اب وہ شاید کبھی نہ آئے گا
اس کے سائے کی دونوں آنکھیں مگر
موت سے اس کی بے خبر ہیں ابھی
اس کی آمد کی منتظر ہیں ابھی

خود کلامی

ادھر دیکھو ہوا کے بازوؤں میں
ایک آہٹ قید ہے
گنجان پیڑوں کی قطاروں میں
نئی پگڈنڈیوں کی سونی آنکھیں
نقوشِ پا تمھارے ڈھونڈتی ہیں

زمیں کروٹ بدلنے کے لیے بے چین سی ہے
آسماں پر رات کی افواج تلواریں لیے
سورج کی جانب بڑھ رہی ہیں

اگر تم چاہتے ہو
اس زمیں پر حکمرانی ہو تمھاری
فزوں کچھ سرگرانی ہو تمھاری
تو میری بات مانو
ہوا کے بازوؤں میں قید اس آہٹ کو
اب آزاد کردو

مشورہ

تھکن اور اداسی تمھاری بجا ہے
زمیں چار سمتوں میں تقسیم کر کے
خلا کی بنا ڈال کر بھی
تمھاری نگاہیں کہاں مطمئن تھیں
کہ وہ اپنی وحشت کے اسباب سے بے خبر تھیں

تھکن اور اداسی تمھاری بجا ہے
زمیں اپنے محور پہ قائم ہے
تم سیکڑوں سال سے
دائروں اور نقطوں میں بکھری ہوئی وسعتوں میں
بھٹکتے ہوئے پھر رہے ہو
کہ منزل کا تم کو پتہ ہی نہیں ہے
تگ و دو تمھاری برائے سفر ہے

تھکن اور اداسی تمھاری بجا ہے
مگر اپنے سائے سے تم کو محبت ہے
تم اس کی خاطر جہاں کی ہر ایک چیز ٹھکرا چکے ہو
اب اس کی حفاظت بھی ہے فرض تم پر
مری بات مانو، مرا ہاتھ تھامو
چلو آنسوؤں سے نہائے ہوئے کوہساروں کے اس سلسلے تک

افسوس حاصل کا

ہوا نے مٹھیوں کو بھینچ کر کھولا تو کیا نکلا

صداؤں کا سمندر

رات کے پھیلے ہوئے صحرا میں ٹھاٹھیں مارتا

سارے نقوشِ پا مٹاتا

ہر شجر کی پتیوں کو نوچتا

سمتوں کے آئینے کو چکنا چور کرتا

ہانپتی پرچھائیوں کے شہر کی جانب

بڑی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے

حمدِ زیست

جب نیند کے پجاری
جب خواب کے بھکاری
صحرائے شب کے سارے
کونوں کو چھان ماریں
اور تھک تھکا کے جب ہوں
مصروف آہ و زاری
اور نامرادیوں کا
نشہ ہو ان پہ طاری
تو صبح کے شجر کی
شاخوں کو گدگداتی
بے نام ساعتوں کی
آمد کے گیت گاتی
آ جانا اس طرف کو
اور بخش دینا کوئی
موتی مرے صدف کو

تلاشِ حق

ہاتھ کسی چراغ کی
لو کی طرف بڑھے ہوئے
ہونٹ کسی گلاب کو
چومنے کو کھلے ہوئے
آنکھ خلا کے آخری
نقطے کو ڈھونڈتی ہوئی
ٹوٹی ہوئی صلیب کے
سائے میں خوں سے تر بہ تر
ریل کی پٹریوں پہ اک
لاش ہے پھر پڑی ہوئی

اپنی یاد میں

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
دور تتلیوں کے ریشمی پروں کے نیلے پیلے رنگ
اڑ رہے ہیں ہر طرف
فرشتے جیسے آسمان سے اتر رہے ہیں صف بہ صف
میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
آنسوؤں کی اوس میں نہا کے بھولے بسرے خواب آ گئے
خون کا دباؤ اور کم ہوا
نحیف جسم پر کسی کے ناخنوں کے آڑے ترچھے نقش
جگمگا اٹھے
لبوں پہ لکنتوں کی برف جم گئی
طویل، ہچکیوں کا ایک سلسلہ
فضا میں ہے
لہو کی بو ہوا میں ہے

تزکیہ

نرم و نازک ریشمی ملبوس کی شکنوں کے پیچھے
کھردرے جذبات مدھم پڑ گئے ہیں
رنگ، خوشبو، لمس کے گنجان جنگل میں
درندوں کی لڑائی ختم پر ہے
تتلیوں کے بوجھ سے پھولوں کی شاخیں جھک گئی ہیں
نیند کے نیزوں سے چھلنی جسم
تھک کر سو گئے ہیں

پرستش کی پشیمانی

آئنوں میں دیوتاؤں کے ادھورے عکس
تکتے تکتے تھک جائیں گی آنکھیں
آسمان بے افق پر
چاند، سورج کی رقابت سے
تمھارے روز و شب کا سلسلہ برہم نہ ہوگا
آنسوؤں سے بھیگے جسموں میں
لہو کی آتش بے دود یوں ٹھنڈی نہ ہوگی
ہماری بات مانو
پتھروں کی پسلیوں سے بے تراشے بت نکالو
اور پرستش کی پشیمانی سے پیشانی سجالو

ایک خوش خبری

ہنسو کہ سرخ و گرم خون پھر سفید ہوگیا
ہنسو کہ نقطۂ امید پھر خلا کے دائرے میں آج قید ہوگیا
ہنسو کہ دشت آرزو میں تھک تھکا کے سب بگولے سو گئے
ہنسو کہ شہر زندگی کا بے فصیل ہوگیا
ہنسو کہ سایۂ صلیب پھر طویل ہوگیا

ایک عجیب خوف

نفرتوں کے آئینے
چور ہونے سے پہلے
ہم کو اپنے چہروں کے
مسخ ہونے کا عرفان
ہو گیا تو کیا ہوگا

جدائی کا گیت

تم میرے کتنے پاس ہو
میں تم سے کتنا دور ہوں

یہ الجھا گولا اون کا
یہ نیلی شیشی عطر کی
یہ ٹوٹی سوئی میز پر
بک شیلف بے ترتیب سا
تصویر وہ دیوار پر
آنگن میں سانسوں کے دیے
کمروں میں خوش بو کے بھنور
تم میرے کتنے پاس ہو
میں تم سے کتنا دور ہوں

زلفیں پریشاں دوش پر
ہاتھوں میں وہ کچھ پھول سے
آنکھوں میں میرے جسم کا
ننھا ادھورا عکس ہے
لب ہل رہے ہیں وہ ادھر
تم میرے کتنے پاس ہو
میں تم سے کتنا دور ہوں
روشن ہیں، دیکھو دور تک
جگنو فضا میں جا بہ جا
پھر آج جلنے کے لیے
نکلے پتنگوں کے پرے
کہنے کو پھر کچھ کان میں
شاخ تمنا جھک گئی
گردش زمیں کی رک گئی
تم میرے کتنے پاس ہو
میں تم سے کتنا دور ہوں

پھر دھوپ کی یلغار میں
دیکھو برہنہ سر ہوں میں

پھر نیند روٹھی آنکھ سے
پھر خواب ٹوٹے ہیں مرے
پھر آنسوؤں سے تر ہوں میں
تم میرے کتنے پاس ہو
میں تم سے کتنا دور ہوں

اے مہرباں، اے ہم سفر
بے رحم ہیں شام و سحر

ان ساعتوں کی دوڑ کا
انجام کیا اس کے سوا
تم اور میرے پاس ہو
میں اور تم سے دور ہوں

چھپتے چھپتے

صدا

جو اک جہان کو جگا رہی تھی نیند سے
سکوت کی صلیب کو سلام کر کے سو گئی
مگر کسی نے اس خبر کو غور سے پڑھا نہیں

دانۂ گندم سے دوری

سمندر خشک ہوتے جارہے ہیں
پیاس سے بے حال ننھی مچھلیوں کے غول
سمتوں کے بھنور میں پھنس گئے ہیں
ان کے پنجے ریت کی گہری تہوں میں دھنس گئے ہیں
ہم آنکھوں کو دہائی دے رہے ہیں
اجنبی بے نام دنیاؤں کے باشندوں کی
پراسرار چیخوں سے
فضاؤں میں ابھی کچھ منجمد سا ہو گیا ہے
زمیں پر سخت چٹانیں ابھرتی آرہی ہیں
دانۂ گندم ہماری دسترس سے دور ہوتا جارہا ہے

غزلیں

○○○

آندھیاں آتی تھیں لیکن کبھی ایسا نہ ہوا
خوف کے مارے جدا شاخ سے پتا نہ ہوا

روح نے پیرہنِ جسم بدل بھی ڈالا
یہ الگ بات کسی بزم میں چرچا نہ ہوا

رات کو دن سے ملانے کی ہوس تھی ہم کو
کام اچھا نہ تھا انجام بھی اچھا نہ ہوا

وقت کی ڈور کو تھامے رہے مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا

خوب دنیا ہے کہ سورج سے رقابت تھی جنھیں
ان کو حاصل کسی دیوار کا سایہ نہ ہوا

○○○

میرے لہو کی چیخ کو کب کوئی آسرا ملا
دشت بھی بے زبان تھا، شہر بھی بے صدا ملا

خواب میں آسمان پر دیکھا تھا میں نے اک افق
آنکھ کھلی تو دور تک دھند کا سلسلہ ملا

تیری گلی کو چھوڑ کر جانے کا قصد جب کیا
میرا ہر ایک راستہ دشت خلا سے جا ملا

برف پگھل کے بہہ گئی، دھوپ کا نام ہو گیا
لیکن یہ راز راز ہے دھوپ کو اس سے کیا ملا

ooo

یہ حقیقت ہے مگر پھر بھی یقیں آتا نہیں
دل مرا اب بھی دھڑکتا ہے پہ گھبراتا نہیں

روح کے بارِ گراں پر ناز کرتے ہیں سبھی
بوجھ اپنے جسم کا کوئی اٹھا پاتا نہیں

سرخ پھولوں سے زمیں کو ڈھک گئی کس کی صدا
سب کی آنکھیں پوچھتی ہیں کوئی بتلاتا نہیں

قرب کا شفاف آئینہ مرا ہمراز ہے
دوریوں کی دھند سے آنکھوں کا کچھ ناتا نہیں

نیند کی شبنم سے میں بھی تر مرا سایہ بھی تر
آنسوؤں کا سیل میری سمت اب آتا نہیں

○○○
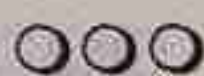
شاخِ شجر سے پتے گرے جب بھی ٹوٹ کے
روئی تمام خلقِ خدا پھوٹ پھوٹ کے

یہ منزلِ مراد تھی انسان کی اگر
انسان کیوں اداس ہے سائے سے چھوٹ کے

صحرا کی سلطنت ہے حدودِ نگاہ تک
بادل ہزار برسے زمینوں پہ ٹوٹ کے

تنہا افق پہ تیغ سے حملہ کرے ہوا
جب چاہے آئے اور اسے لے جائے لوٹ کے

سچ کی صلیب توڑ دی اہلِ صلیب نے
سرشار اس قدر ہوئے نشے سے جھوٹ کے

○○○

دل پریشاں ہو مگر آنکھ میں حیرانی نہ ہو
خواب دیکھو کہ حقیقت سے پشیمانی نہ ہو

کیا ہوا اہلِ جنوں کو کہ دعا مانگتے ہیں
شہر میں شور نہ ہو دشت میں ویرانی نہ ہو

ڈھونڈتے ڈھونڈتے سب تھک گئے لیکن نہ ملا
اک افق ایسا کہ جو دھند کا زندانی نہ ہو

غم کی دولت بڑی مشکل سے ملا کرتی ہے
سونپ دو ہم کو اگر تم سے نگہ بانی نہ ہو

نفرتوں کا وہی ملبوس پہن لو پھر سے
عین ممکن ہے یہ دنیا تمھیں پہچانی نہ ہو

○○○

یوں تو کرنے کو یہاں کوششیں ہر شخص نے کیں
کھیتیاں دل کی سرابوں سے نہ سرسبز ہوئیں

میری آواز پہ دیتا نہیں کوئی آواز
شہر سناٹوں کے سیلاب کی زد میں تو نہیں

بے افق آسماں بھی دھند میں چھپ جائے گا
چند دن اور جو آنکھیں یونہی حیران رہیں

جسم کو آئینۂ روح میں دیکھا ہوتا
تو یہ دنیا نظر آتی نہ کبھی اتنی حسیں

تیز آندھی کا کرم ہو تو نجات ان کی ہو
راکھ کی قید میں چنگاریاں مرجھانے لگیں

○○○

ہزار بار مٹی اور پائمال ہوئی
ہماری زندگی تب جا کے بے مثال ہوئی

اسی سبب سے تو پرچھائیں اپنے ساتھ نہیں
صعوبتِ سفرِ شوق سے نڈھال ہوئی

سکون پھر بھی تو وحشت سرائے دل میں نہیں
نگاہِ یار اگرچہ شریکِ حال ہوئی

خوشی کے لمحے تو جوں توں گزر گئے ہیں یہاں
بس ایک ساعتِ غم کاٹنی محال ہوئی

لکیر نور کی جو آسمانِ دل پہ بنی
اندھیری رات کا حملہ ہوا تو ڈھال ہوئی

○○○
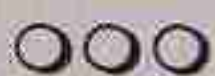
دل میں رکھتا ہے نہ پلکوں پہ بٹھاتا ہے مجھے
پھر بھی اس شخص میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

ساری آوازوں کو سناٹے نگل جائیں گے
کب سے رہ رہ کے یہی خوف ستاتا ہے مجھے

یہ الگ بات کہ دن میں مجھے رکھتا ہے نڈھال
رات کی زد سے تو سورج ہی بچاتا ہے مجھے

اک نئے قہر کے امکان سے بوجھل ہے فضا
آسماں دھند میں لپٹا نظر آتا ہے مجھے

تذکرہ اتنا ہوا روح کی آلودگی کا
جسم صد چاک بھی آئینہ دکھاتا ہے مجھے

○○○

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

برہنہ جسم بگولوں کا قتل ہوتا رہا
خیال بھی نہیں آیا کسی کو رونے کا

صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا
مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا

بچھڑ کے تجھ سے مجھے یہ گمان ہوتا ہے
کہ میری آنکھیں ہیں پتھر کی جسم سونے کا

ہجوم دیکھتا ہوں جب تو کانپ اٹھتا ہوں
اگرچہ خوف نہیں اب کسی کے کھونے کا

گئے تھے لوگ تو دیوار قہقہہ کی طرف
مگر یہ شور مسلسل ہے کیسا رونے کا

مرے وجود پہ نفرت کی گرد جمتی رہی
ملا نہ وقت اسے آنسوؤں سے دھونے کا

ہجر کے موسم

(۱۹۷۸)

نجمہ شہریار

کے

نام

آنکھوں میں تیری دیکھ رہا ہوں میں اپنی شکل
یہ کوئی واہمہ، یہ کوئی خواب تو نہیں

پیش لفظ

گذشتہ بیس برس میں شاعری میں جن ناموں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے، ان میں شہریار کا نام بھی شامل ہے، وہ اُردو کے اُن چند شاعروں میں ہیں جن کی شاعری کو قدیم اور جدید کا حسین ترین امتزاج کہا جاسکتا ہے۔

شہریار نے کلاسیکی شاعری کی توانا، زندہ اور مثبت روایات سے اپنے فن کے چراغ روشن کیے ہیں۔ اور عصری زندگی کی آگہی کے کرب سے احساس اور اظہار کو تازگی اور جدت سے ہم آہنگ کیا ہے۔

شہریار کے لب و لہجے پر زندگی کی ناہمواریوں، ناکامیوں، اور یاسیت کی تلخی اور درشتی کی گہری پرچھائیاں ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی طنزیہ مُسکراہٹ بھی اس لب و لہجے میں شامل ہے، جس کی وجہ سے تلخی میں شدت پیدا ہوگئی ہے، لیکن یہ تلخی اُن حدود کو پار نہیں کرتی جہاں فن کار پر قنوطی یا یاسیت پسند ہونے کا الزام عاید ہوتا ہے۔

شہریار اپنے دھیمے اور گنگناتے لب و لہجے، آواز کی جرأت مندی اور مستقبل پر بھرپور اعتماد کے اظہار سے اس تلخی کو ہمارے لیے گوارا بنا دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کے تخلیقی شعور اور فکر کی تشکیل مانگے کے اُجالے سے نہیں، بلکہ عصری زندگی کے مشاہدے سے ہوتی ہے۔ اسی لیے اُن کی فکر میں انتشار نہیں ہے۔ بلکہ وہ مربوط، مسلسل اور منطقی ہے۔ اس لیے اُن کے ہاں بہت کم تضاد نظر آتا ہے، اُن کے دُکھ ذاتی ہیں۔ لیکن انھوں نے

اپنی ذات کو اتنی وسعت دے دی ہے کہ ان کا پورا عہد اور پوری کائنات اس ذات میں سمٹ آتی ہے۔ اب یہ دُکھ کسی ایک شخص کے نہیں، بلکہ ہر انسان کے دُکھ ہیں۔ ایک سچے فن کار کی طرح شہریار انسان کی بنیادی اعلیٰ اقدار کی تلاش میں خود کو گم کیے ہوئے ہیں۔ وہ مسرتوں سے لبریز ایک ایسی زندگی کے متلاشی ہیں جو ہر انسان کا خواب ہے۔

شہریار نے اپنی فکر کی طرح شعری علائم اور تلازمے بھی مستعار نہیں لیے ہیں۔ وہ نئے حسی تجربات کو چونکا دینے والے الفاظ میں نہیں، بلکہ خود ہماری اپنی مانوس زبان میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے جذبے اور احساس کے کرب کی صداقت ہمارے دلوں میں اُتر جاتی ہے اور ہمارا ذہن زندگی سے متنفر ہونے کے بجائے حسین خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ بڑا فن وہی ہے جو زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ بڑا فن عصری زندگی کے اثرات سے آزاد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میر یا غالب کے بے شمار شعر آج بھی ہماری زندگی پر صادق آتے ہیں۔ جب کہ ہم یہ تجزیہ کرسکتے ہیں کہ ان شعرا نے اپنے عہد کے کن حالات سے متاثر ہو کر یہ شعر کہے تھے۔ شہریار کے ہاں ایسے اشعار اور ایسی نظموں کی خاصی تعداد ہے جس میں زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہونے کی بھر پور صلاحیت ہے۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۸

خلیق انجم
جنرل سکریٹری

غزلیں

○○○

کارِ دنیا سے فرومایہ محبت نکلی
اہلِ دل میں بھی بہت جینے کی حسرت نکلی

تم کہو زیست کو کس رنگ میں دیکھا تم نے
زندگی اپنی تو خوابوں کی امانت نکلی

ابتدا عشق سے افسانۂ ہستی کی ہوئی
انتہا اس کی مگر صرف مروّت نکلی

جوئے خوں آنکھوں سے ہم نے بھی بہائی لیکن
کم ہوا بوجھ ہی دل کا نہ کدورت نکلی

پھر کوئی منزلِ بے نام بُلاتی ہے ہمیں
رہنمائی کے لیے دھوپ کی شدّت نکلی

پاس کی چیزوں پہ دوری کے دھند لکے چھائے
بچھڑے لوگوں سے ملاقات کی صورت نکلی

○○○
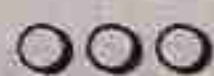
دھوپ کے دشت میں بے سایہ شجر میں ہم تھے
منہمک پھر بھی سرابوں کے سفر میں ہم تھے

منتشر کر چکی آندھی تو یہ معلوم ہوا
اک بگولے کی طرح ریت کے گھر میں ہم تھے

تیری آواز کے جادو نے خبردار کیا
ناسمجھ تھے کہ بلاؤں کے اثر میں ہم تھے

تا نہ شاکی رہے دریائے ہوس کی کوئی موج
بادباں جسم کے کھولے کہ بھنور میں ہم تھے

یہ ترے قُرب کا اعجاز ہے ورنہ پہلے
طاق اتنے کہاں جینے کے ہُنر میں ہم تھے

○○○

نشاطِ غم بھی ملا، رنجِ شاد مانی بھی
مگر وہ لمحے بہت مختصر تھے فانی بھی

کُھلی ہے آنکھ کہاں، کون موڑ ہے یارو
دیارِ خواب کی باقی نہیں نشانی بھی

رگوں میں ریت کی اک اور تہ جمی دیکھو
کہ پہلے جیسی نہیں خون میں روانی بھی

بھٹک رہے ہیں تعاقب میں اب سرابوں کے
ملا نہ جن کو سمندر سے بوند پانی بھی

زمیں بھی ہم سے بہت دُور ہوتی جاتی ہے
ڈرا رہی ہے خلاؤں کی بیکرانی بھی

طویل ہونے لگی ہیں اِسی لیے راتیں
کہ لوگ سُنتے سُناتے نہیں کہانی بھی

○○○
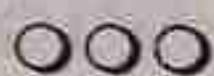
حدِّ نگاہ تک یہ زمیں ہے سیاہ پھر
نِکلی ہے جگنوؤں کی بھٹکتی سپاہ پھر

ہونٹوں پہ آ رہا ہے کوئی نام بار بار
سنّاٹوں کے طلسم کو توڑے گی آہ پھر

پچھلے سفر کی گرد کو دامن سے جھاڑ دو
آواز دے رہی ہے کوئی سُونی راہ پھر

بے رنگ آسمان کو دیکھے گی کب تلک
منظر نیا تلاش کرے گی نِگاہ پھر

ڈھیلی ہوئی گرفت جنوں کی کہ جَل اُٹھا
طاقِ ہوس میں کوئی چراغِ گناہ پھر

○○○

زندگی بھیس نئے شام و سحر بدلا کی
آنکھ کا کام تھا بس دیکھنا سو دیکھا کی

رنگِ وحشت سے سبھی رنگ بہت دھندلے تھے
شہر کا خاکہ تھا، تصویر بنی صحرا کی

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

پیاس کا کیا تھا سرابوں سے بھی بجھ سکتی تھی
یاد آتی رہی ہر آن مگر دریا کی

تانہ پھر خوشۂ گندم سے پشیمانی ہو
دل میں ہر شخص نے جینے کی ہوس پیدا کی

○○○
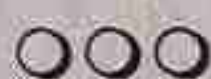
ہوا تو کہاں ہے زمانے ہوئے
سمندر کے پانی کو ٹھہرے ہوئے

لہو سب کا سب آنکھ میں آ گیا
ہرے پھول سے جسم پیلے ہوئے

جنوں کا ہر اک نقش مٹ کر رہا
ہوس کے سبھی خواب پورے ہوئے

مناظر بہت دور اور پاس ہیں
مگر آئینے سارے دھندلے ہوئے

جہاں جایئے ریت کا سلسلہ
جدھر دیکھیے شہر اجڑے ہوئے

بڑا شور تھا جب سماعت گئی
بہت بھیڑ تھی جب اکیلے ہوئے

ہنسو آسماں بے افق ہو گیا
اندھیرے گھنے اور گہرے ہوئے

سنو اپنی ہی بازگشتیں سنو
کرو یاد افسانے بھولے ہوئے

چلو جنگلوں کی طرف پھر چلو
بلاتے ہیں پھر لوگ بچھڑے ہوئے

○○○
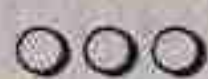
کُھلے جو آنکھ کبھی، دیدنی یہ منظر ہیں
سمندروں کے کناروں پہ ریت کے گھر ہیں

نہ کوئی کھڑکی، نہ دروازہ واپسی کے لیے
مکانِ خواب میں جانے کے سیکڑوں در ہیں

گلاب ٹہنی سے ٹوٹا زمین پر نہ گرا
کرشمے تیز ہوا کے سمجھ سے باہر ہیں

کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا سراب سب کا ہے
سبھی ہیں پیاس کے مارے سبھی برابر ہیں

حسینؓ ابنِ علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

○○○

پہلے نہائی اوس میں پھر آنسوؤں میں رات
یوں بوند بوند اُتری ہمارے گھروں میں رات

کچھ بھی دکھائی دیتا نہیں دُور دُور تک
چبھتی ہے سوئیوں کی طرح جب رگوں میں رات

وہ کُھردری چٹانیں وہ دریا وہ آبشار
سب کچھ سمیٹ لے گئی اپنے پروں میں رات

آنکھوں کو سب کی نیند بھی دی خواب بھی دیئے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات

بے سمت منزلوں نے بُلایا ہے پھر ہمیں
سناٹے پھر بچھانے لگی راستوں میں رات

○○○

سورج کا سفر ختم ہوا، رات نہ آئی
حصے میں مرے، خوابوں کی سوغات نہ آئی

موسم ہی پہ ہم کرتے رہے تبصرہ تا دیر
دل جس سے دُکھیں ایسی کوئی بات نہ آئی

یوں ڈور کو ہم وقت کی پکڑے تو ہوئے تھے
اک بار مگر چھوٹی تو پھر ہات نہ آئی

ہمراہ کوئی اور نہ آیا تو گلہ کیا
پرچھائیں بھی جب میری مرے ساتھ نہ آئی

ہر سمت نظر آتی ہیں بے فصل زمینیں
امسال بھی اس شہر میں برسات نہ آئی

○○○

ہم پڑھ رہے تھے خواب کے پُرزوں کو جوڑ کے
آندھی نے یہ طلسم بھی رکھ ڈالا توڑ کے

آغاز کیوں کیا تھا سفر ان خلاؤں کا
پچھتا رہے ہو سبز زمینوں کو چھوڑ کے

اک بُوند زہر کے لیے پھیلا رہے ہو ہاتھ
دیکھو کبھی خود اپنے بدن کو نچوڑ کے

کچھ بھی نہیں جو خواب کی صورت دکھائی دے
کوئی نہیں جو ہم کو جگائے جھنجوڑ کے

ان پانیوں سے کوئی سلامت نہیں گیا
ہے وقت اب بھی کشتیاں لے جاؤ موڑ کے

○○○

ہر ایک سمت خموشی ہے، رات کالی ہے
نہ جانے کون سی اُفتاد پڑنے والی ہے

یہ کون موڑ ہے اے زندگی کہ دل اپنا
خوشی سے بھی ہے تہی، درد سے بھی خالی ہے

وہ دیکھو ریت کی تہہ اور بھی دبیز ہوئی
ہماری پیاس بجھی ہے، نہ بُجھنے والی ہے

بنا ہوا ہے ازل سے نگاہ کا مرکز
وہ اک اُفق کہ جہاں دُھند ہے نہ لالی ہے

عذاب کوئی بھی تنہائیوں کا سہہ نہ سکا
ہر ایک شخص نے اک انجمن بنالی ہے

○○○

(ناصر کاظمی کی یاد میں)

بھٹک گیا کہ منزلوں کا وہ سُراغ پا گیا
ہمارے واسطے خلا میں راستہ بنا گیا

صُراحیِ دل کی آنسوؤں کی اوس سے بھری رہی
اسی لیے عذابِ ہجر اُس کو راس آ گیا

سَراب کا طلسم ٹوٹنا بہت بُرا ہوا
کہ آج تشنگی کا اعتبار بھی چلا گیا

تمام عمر خواب دیکھنے میں منہمک رہا
اور اس طرح حقیقتوں کو واہمہ بنا گیا

○○○

دل میں اُترے گی تو پوچھے گی جنوں کتنا ہے
نوکِ خنجر ہی بتائے گی کہ خوں کتنا ہے

آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچمِ خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے

جمع کرتے رہے جو اپنے کو ذرّہ، ذرّہ
وہ یہ کیا جانیں بکھرنے میں سکوں کتنا ہے

وہ جو پیاسے تھے سمندر سے بھی پیاسے لوٹے
ان سے پوچھو کہ سرابوں میں فسوں کتنا ہے

ایک ہی مٹی سے ہم دونوں بنے ہیں لیکن
تجھ میں اور مجھ میں مگر فاصلہ یوں کتنا ہے

○○○

چمن در چمن پائمالی رہے
ہوا تیرا دامن نہ خالی رہے

ذرا ایک کروٹ کہ اشجار پر
کوئی پھول باقی نہ ڈالی رہے

کہیں سبز فصلیں دکھائی نہ دیں
زمیں پر یونہی خشک سالی رہے

جہاں معترف ہے ترے قہر کا
ابد تک تری بے مثالی رہے

خزاں، آگ، سیلاب اور تیرگی
ترے در پہ ہر شے سوالی رہے

بڑھے اور بھی دُھند کا دائرہ
اُفق پر لہو رنگ لالی رہے

نہ میلی ہو مہندی ترے ہاتھ کی
سدا آنکھ کاجل سے کالی رہے

○○○

ہوا چلے ورقِ آرزو پلٹ جائے
طلوع ہو کوئی چہرہ تو دھند چھٹ جائے

یہی ہے وقت کہ خوابوں کے بادباں کھولو
کہیں نہ پھر سے ندی آنسوؤں کی گھٹ جائے

بلندیوں کی ہوس ہی زمین پر لائی
کہو فلک سے کہ اَب راستے سے ہٹ جائے

گرفت ڈھیلی کرو وقت کو گزرنے دو
کہ ڈور پھر نہ کہیں ساعتوں کی کٹ جائے

اسی لیے نہیں سوتے ہیں ہم کہ دُنیا میں
شبِ فراق کی سوغات سب میں بٹ جائے

○○○

پھر فزوں ہو دل کی وحشت، سرگرانی کم نہ ہو
آنکھ کے گہرے سمندر تیرا پانی کم نہ ہو

ایک ذرے میں سمٹ آئے جہانِ آب و گل
دشت تنہائی کی لیکن بیکرانی کم نہ ہو

یا کبھی ہم کو خیالِ چشمۂ حیواں نہ آئے
یا سرابوں کے سفر کی شادمانی کم نہ ہو

بڑھ رہا ہے پھر رگوں میں برف جم جانے کا خوف
جاگتے جیتے لہو تیری روانی کم نہ ہو

○○○

ایسے ہجر کے موسم کب کب آتے ہیں
تیرے علاوہ یاد ہمیں سب آتے ہیں

جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھو دُنیا کو
خوابوں کا کیا ہے وہ ہر شب آتے ہیں

جذب کرے کیوں ریت ہمارے اشکوں کو
تیرا دامن تر کرنے اب آتے ہیں

اَب وہ سفر کی تاب نہیں باقی ورنہ
ہم کو بُلاوے دشت سے جب تب آتے ہیں

کاغذ کی کشتی میں دریا پار کیا
دیکھو ہم کو کیا کیا کرتب آتے ہیں

نظمیں

خواب دیکھنے والی آنکھیں

کتنی تیز تھی آندھی
آنکھیں ملتے ملتے، سورج ڈوبا شام ہوئی
دُور سے آتی آوازیں
اور ان کے پیچھے شور مچاتے
رنگ رنگ کی پوشاکوں میں ریت بھرے دستانے پہنے ننھے بچے
ان کے پیچھے اُن سے بھی کچھ چھوٹے بچے
ان کے آگے لمبے سائے، آدھی رات کے سنّاٹے
شبنم کے قطرے
خواب دیکھنے والی آنکھیں روتی ہیں
خواب دیکھنے والی آنکھیں کیا دیکھیں؟

بارش

بے دائرہ نقطوں کو گنے جائیں گے کب تک
سناٹوں کی آواز سُنے جائیں گے کب تک
سڑکوں پہ پتنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
بارش کے سبب سے
اک آنکھ میں ہم اور زمیں چاند ستارے
اس سحر سے اس قہر سے
بچنے کی کوئی راہ نکالیں
تا ہم کہ کوئی اجنبی سرحد سے پکارے
تاریکیِ شب سے
اُکتائے ہوئے ہم بھی بہت ہیں
گھبرائے ہوئے ہم بھی بہت ہیں
چومیں کسی پرچھائیں کی پیشانی کا سورج
دیکھیں کسی خوشبو کا بدن ہم بھی برہنہ
نغمہ سنیں ہم بھی کسی دیوار کے لب سے
سڑکوں پہ پتنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
بارش کے سبب سے

فنا کی تصویر

(اپنے بڑے بھائی کے انتقال پر)

بے آواز بدن کا سایہ
ان شاخوں کے پیچھے ڈوبا
جن سے دھند جنم لیتی ہے
چاند بھی جن سے خوفزدہ سورج بھی شاکی
شاخیں، بڑھتی پھیلتی شاخیں
آڑی، ترچھی، پتلی شاخیں
ریشم کے تاروں کی صورت اُلجھی شاخیں
ان شاخوں کے پیچھے دیکھو کھیل انوکھا

روئی کے گالے آس پاس اور ان کے تعاقب
میں ننھی باہوں کے ہالے
اوس کی بوند کا بوجھ نہیں اُٹھتا آنکھوں سے
مت کھولو زنجیریں پاگل تیز ہوا کی
رُک جاؤ بن جانے دو تصویر فنا کی

اعتراف

ہم بہت بزدل ہیں
ہم اقرار کرتے ہیں
آسمانوں سے اُدھر لے جا کے ہم کو پھینک دو
نیچے بہت نیچے
مگر یہ التجا ہے
ہاتھ، آنکھیں، کان، لب
باقی رہیں یا ختم ہو جائیں
بَس اک یہ ریڑھ کی ہڈی نہ ٹوٹے
رینگتے رہنے کی یہ عادت نہ چھوٹے

نجمہ کے لیے ایک نظم

کیا سوچتی ہو
دیوارِ فراموشی سے اُدھر کیا دیکھتی ہو
آئینہ خواب میں آنے والے لمحوں کے منظر دیکھو
آنگن میں پُرانے نیم کے پیڑ کے سائے میں
بھیو* کے جہاز میں بیٹھی ہوئی ننھی چڑیا
کیوں اُڑتی نہیں
جنگل کی طرف جانے والی وہ ایک اکیلی پگڈنڈی
کیوں مُڑتی نہیں
ٹوٹی زنجیر صداؤں کی کیوں جُڑتی نہیں
اک سُرخ گلاب لگالو اپنے جوڑے میں
اور پھر سوچو

* میرا بیٹا ہمایوں شہریار

بے اُفق آسماں کا سفر

بے اُفق آسماں کے سفر کے لیے
سیڑھیاں بن رہی ہیں ہمارے لیے
سانپ کی شکل کی نہر
اور نہر کے صاف وشفاف پانی پہ بہتی ہوئی کشتیاں
کشتیوں سے اُلجھتے ہوئے بادباں
اور کناروں پہ اشجار
اشجار کے سائے میں کچھ مکاں
آبشاروں کے گرنے کی آواز کی گونج کی
سرخ، نیلی، ہری، سرمئی مشعلیں
مشعلوں کا دھواں
اور ان سے اُدھر
کھردری سخت چٹانوں کی ہچکیاں
سیڑھیاں بن رہی ہیں ہمارے لیے
دائروں اور نقطوں میں تحلیل ہوتے ہوئے روز وشب
آنکھ کی سرحدوں سے ہٹیں تو چلیں
بے اُفق آسماں کے سفر کے لیے

منظّم مناظر سے آگے

بہار اور خزاں، موت اور زندگی کے منظّم مناظر سے
آگے بھی کچھ ایسے منظر ہیں
آنکھوں کی جن تک رسائی نہیں
شجر جس کی ساری جڑیں آسمانوں میں پھیلی ہیں
اور ٹہنیاں، کُھردری، سخت، لاوا اُگلتی
زمیں کے بدن میں مسلسل اُترتی چلی جارہی ہیں
ہوا کے سمندر میں بے بادباں کشتیوں پر
درندے،
لہو رنگ خوشبو کی دیوار کا گہرا سایہ
ہری سرخ، نیلی، سیہ روشنی
روشنی کی لکیریں
لکیروں کی آواز
آواز کا دائرہ
دائرے اور نقطے میں بڑھتا ہوا فاصلہ
فاصلہ اور سفر
بہار اور خزاں، موت اور زندگی کے منظّم مناظر سے
آگے بھی کچھ ایسے منظر ہیں
آنکھوں کی جن تک رسائی نہیں ہے

سفر کی ایک منزل

ہماری کشتی کے بادباں سے
ہوا الجھتی ہے پوچھتی ہے
کہ تم نے خشکی کے سب نشانات کیوں مٹائے

سمندروں کے سفر میں جی کا زیاں بہت ہے
سمندروں میں سفر کی منزل فقط سمندر
سمندروں میں سفر کا حاصل فقط سمندر
چراغ خوابوں کے کیوں بجھائے
ہماری کشتی کے بادباں سے
ہوا اُلجھتی ہے پوچھتی ہے
کہ تم نے خشکی کے سب نشانات کیوں مٹائے

پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا

برف بے موسم گری
چٹان سے میدان تک
بے درختوں کی زمیں
بے اُون بھیڑوں کے لیے
زندہ رہنا اور مرنا دونوں مشکل ہو گئے
آنکھ بے منظر خلا کو
تکتے تکتے تھک گئی
وقت کی رفتار کو
بتلانے والی سوئیاں
ہندسوں کی بے صلہ، بیکار گردش کرتے کرتے رُک گئیں
آڑے، ترچھے، اونچے، نیچے راستے
بَرف کی موٹی تہوں میں چھپ گئے
پھر سفر بے سمت، بے منزل ہوا
برف کے اُجلے بدن کی
ننھی نیلی رگوں میں

کون سورج بن کے دوڑے
کس طرح یہ برف پگھلے
آگ بے شعلہ ہوئی
پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا
بے اون بھیڑوں کے لیے
زندہ رہنا اور مرنا دونوں مشکل ہو گئے

تلاشِ حق

ہاتھ کسی چراغ کے
لو کی طرف بڑھے ہوئے
ہونٹ کسی گلاب کے
چومنے کو کھلے ہوئے
آنکھ خلا کے آخری
نقطے کو ڈھونڈتی ہوئی
ٹوٹی ہوئی صلیب کے
سائے میں خوں سے تر بہ تر
ریل کی پٹریوں پہ اک
لاش ہے پھر پڑی ہوئی

اپنی یاد میں

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
دور تتلیوں کے ریشمی پروں کے نیلے پیلے رنگ
اڑ رہے ہیں ہر طرف
فرشتے جیسے آسمان سے اتر رہے ہوں صف بہ صف
میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
آنسوؤں کی اوس میں نہا کے بھولے بسرے خواب یاد آگئے
خون کا دباؤ اور کم ہوا
نحیف جسم پر کسی کے ناخنوں کے آڑے ترچھے نقش
جگمگا اٹھے
لبوں پہ لکنتوں کی برف جم گئی
طویل ہچکیوں کا ایک سلسلہ
فضا میں ہے
لہو کی بو ہوا میں ہے

پرچھائیاں

رات کے بے کنار صحرا میں
اپنی تنہائیوں سے لڑتی ہوئی
زخمی روحوں کی پیاسے جسموں کی
ساری پرچھائیاں شہید ہوئیں
یہ خبر تازہ روزنامے کی
کس ورق پر چھپی تھی یاد نہیں

ٹھہرے جو ہوا

آنکھ میں سہمے ہوئے منظر کو دکھائیں
شبنم سے لدی شاخ کی تصویر بنائیں
وہ دُور اُدھر
ریت کی دیوار تھی
دیوار کے پیچھے
اک شہر تھا
اُس شہر کی سرحد پہ بہت لوگ کھڑے تھے
وہ لوگ خلاؤں کی طرف دیکھ رہے تھے
اور شہر کی ہر راہ پہ سناٹے بچھے تھے
اس شہر کی روداد سُنیں اور سُنائیں
پلکوں سے چلو ریت کی دیوار گرائیں
ٹھہرے جو ہوا
آنکھ میں سہمے ہوئے منظر کو دیکھائیں

واماندگیِ شوق

کھڑی رہو

اسی جگہ اسی طرح کھڑی رہو

سفید برف کی چٹان قطرہ قطرہ گل رہی ہے

گلنے دو

سیاہ اور طویل رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی ہے

ڈھلنے دو

مری نگاہ کے حصار میں یونہی کھڑی رہو

میں تم سے اور دور ہو رہا ہوں مجھ سے مت ڈرو

ان اُنگلیوں پہ اوس کے نشان تھے جو مٹ گئے

لبوں پہ ایک اجنبی کا نام تھا جو بُجھ گیا

ہرن کی آنکھ خوف کی چمک سے بھی تہی ہوئی

درندے جنگلوں کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے

کھڑی رہو

اسی جگہ اسی طرح کھڑی رہو

بارش

بے دائرہ نقطوں کو گنے جائیں گے کب تک
سناٹوں کی آواز سنے جائیں گے کب تک
سڑکوں پہ پتنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
بارش کے سبب سے
محصور ہیں کب سے
اک آنکھ میں ہم اور زمیں چاند ستارے
اس سحر سے اس قہر سے
بچنے کی کوئی راہ نکالیں
تا ہم کو کوئی اجنبی سرحد سے پکارے
تاریکیٔ شب سے
اکتائے ہوئے ہم بھی بہت ہیں
گھبرائے ہوئے ہم بھی بہت ہیں
چومیں کسی پرچھائیں کی پیشانی کا سورج
دیکھیں کسی خوشبو کا بدن ہم بھی برہنہ
نغمہ سنیں ہم بھی کسی دیوار کے لب سے
سڑکوں پہ پتنگوں سے سوا کچھ بھی نہیں اب
بارش کے سبب سے

خواب کا در بند ہے

(۱۹۸۵)

وجے کمار بجاج

کے

اور

پہلے عشق

کے

نام

تبصرہ

شہریار اس دور کے ان ممتاز شاعروں میں سے ہیں، جو اپنی غزلوں اور نظموں کی خواب آلودہ فضا، اپنے مخصوص لہجے اور اس میں معانی کی نت نئی پرتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ بہت سے نئے شاعروں کی آواز اجنبی سی معلوم ہوتی ہے مگر شہریار کی آواز نئی ہونے کے باوجود مانوس ہے۔ اچھی شاعری نئی ہوتے ہوئے مانوس بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے صرف باہر کے درخت کو ہی نہیں دیکھا یا دکھایا، اپنے اندر بھی ایک باغ اگایا ہے، جس کے رنگ اور خوشبوئیں ہمارے دلوں کو چھوتی ہیں۔ اس دور کرب و بلا نے انھیں بہت سے زخم دیے ہیں، مگر وہ ان زخموں پر نالہ و فریاد کرنے کے بجائے مسکراتے ہیں۔ ان کے یہاں درد کی جوئیں ہے، اس کی وجہ سے ان کے لہجے میں ایک حزن ضرور ہے مگر اس میں irony کی لطافت بھی ہے اور تہ داری بھی۔ ان کا کلام سن کر اور پڑھ کر مجھے اس کنکری کا خیال آتا ہے جو پانی میں گرتے ہی لہروں کے ان گنت دائرے بناتی ہے۔ اس طرح ان کے یہاں ریت، پانی، چٹان، صحرا، شہر خواب سب اپنی کہانیاں کہتے رہتے ہیں۔ ادھر ان کے یہاں ہموار اور مقبول بحروں کے مقابلے میں جذبے اور خیال کے لیے کچھ آزادی نظر آئی۔ شاید اس سے ان کا ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔

شہریار برابر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور اردو شاعری کو ان سے ابھی بہت کچھ توقعات ہیں۔ خدا کرے وہ تکرار اور تکان سے محفوظ رہیں۔

آل احمد سرور

خواب کا در بند ہے

میرے لیے رات نے
آج فراہم کیا
ایک نیا مرحلہ

نیندوں سے خالی کیا
اشکوں سے پھر بھر دیا
کاسہ مری آنکھ کا
اور کہا کان میں
”میں نے ہر اک جرم سے
تم کو بَری کر دیا
میں نے سدا کے لیے
تم کو رہا کر دیا
جاؤ، جدھر چاہو تم
جاگو کہ سو جاؤ تم
خواب کا در بند ہے“

غزلیں

○○○

آنکھ کی یہ ایک حسرت تھی کہ بس پوری ہوئی
آنسوؤں میں بھیگ جانے کی ہوس پوری ہوئی

آ رہی ہے جسم کی دیوار گرنے کی صدا
اک عجب خواہش تھی جواب کے برس پوری ہوئی

اس خزاں آثار لمحے کی حکایت ہے یہی
اک گلِ ناآفریدہ کی ہوس پوری ہوئی

آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہو گیا
ہو مبارک آرزوے خار و خس پوری ہوئی

کیسی دستک تھی کہ دروازے مقفل ہو گئے
اور اس کے ساتھ رودادِ قفس پوری ہوئی

○○○

سرخی ذرا سی خواب کے خنجر پہ دیکھ کر
سب رو رہے ہیں چادرِ شب سر پہ دیکھ کر

ہر شخص مضمحل ہے بکھرنے کے خوف سے
آندھی کا قہر سرو و صنوبر پہ دیکھ کر

خوشبو بگولہ بن کے جدا رنگ سے ہوئی
موجِ صبا کو سرحدِ صرصر پہ دیکھ کر

چٹانیں، آبشار، سمندر تھے ہر طرف
پانی کی ایک بوند کو پتھر پہ دیکھ کر

سرگوشیوں کے سبز بدن زرد ہو گئے
جگنو سکوتِ شام کے بستر پہ دیکھ کر

وحشت تلاش کرتی ہے صحراؤں میں جسے
حیراں ہے سارا شہر اسے گھر پہ دیکھ کر

○○○

زندگی جیسی توقع تھی نہیں، کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے

اب جدھر دیکھیے لگتا ہے کہ اس دنیا میں
کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے

آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب
یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں، کچھ کم ہے

○○○

تمام خلق خدا دیکھ کے یہ حیراں ہے
کہ سارا شہر مرے خواب سے پریشاں ہے

میں اس سفر میں کسی موڑ پر نہیں ٹھہرا
رہا خیال کہ وہ وادیٔ غزالاں ہے

یہ ایک میں کہ تری آرزو ہی سب کچھ ہے
وہ ایک تو کہ مرے سائے سے گریزاں ہے

تو حافظے سے ترا نام کیوں نہیں مٹتا
جو یاد رکھنا ہے مشکل بُھلانا آساں ہے

میں اس کتاب کے کس باب کو پڑھوں پہلے
وصال جس کا ہے مضموں فراق عنواں ہے

○○○

ماحول میرے شہر کا ہاں پرسکوں نہ تھا
لیکن بتا ہوا یہ قبیلوں میں یوں نہ تھا

اے اہلِ درد تم نے سمجھنے میں دیر کی
کارِ حیات مانعِ کارِ جنوں نہ تھا

چاہا بہت کہ دشت کو گلزار کر سکوں
میرے بدن میں خون تو تھا اتنا خوں نہ تھا

دنیا نے ہر محاذ پہ مجھ کو شکست دی
یہ کم نہیں کہ خواب کا پرچم نگوں نہ تھا

وعدے پہ تیرے میں نے کبھی شک نہیں کیا
پھر تیرا انتظار مجھے رات کیوں نہ تھا

○○○

زخموں کو رفو کر لیں دل شاد کریں پھر سے
خوابوں کی کوئی دنیا آباد کریں پھر سے

مدت ہوئی جینے کا احساس نہیں ہوتا
دل ان سے تقاضا کر بیداد کریں پھر سے

مجرم کے کٹہرے میں پھر ہم کو کھڑا کر دو
ہو رسمِ کہن تازہ فریاد کریں پھر سے

اے اہلِ جنوں دیکھو زنجیر ہوئے سائے
ہم کیسے انہیں، سوچو، آزاد کریں پھر سے

اب جی کے بہلنے کی ہے ایک یہی صورت
بیتی ہوئی کچھ باتیں ہم یاد کریں پھر سے

○○○

نیند کی اوس سے پلکوں کو بھگوئے کیسے
جاگنا جس کا مقدر ہو وہ سوئے کیسے

ریت دامن میں ہو یا دشت میں بس ریت ہی ہے
ریت میں فصلِ تمنا کوئی بوئے کیسے

یہ تو اچھا ہے کوئی پوچھنے والا نہ رہا
کیسے کچھ لوگ ملے تھے ہمیں کھوئے کیسے

روح کا بوجھ تو اٹھتا نہیں دیوانے سے
جسم کا بوجھ مگر دیکھیے ڈھوئے کیسے

ورنہ سیلاب بہا لے گیا ہوتا سب کچھ
آنکھ کو ضبط کی تاکید ہے روئے کیسے

○○○

تیرے سوا بھی کوئی مجھے یاد آنے والا تھا
میں ورنہ یوں ہجر سے کب گھبرانے والا تھا

جان بوجھ کر، سوچ سمجھ کر میں نے بھلا دیا
ہر وہ قصہ جو دل کو بہلانے والا تھا

مجھ کو ندامت بس اس پر ہے لوگ بہت خوش ہیں
اس لمحے کو کھو کر جو پچھتانے والا تھا

یہ تو خیر ہوئی دریا نے رخ تبدیل کیا
میرا شہر بھی اس کی زد میں آنے والا تھا

اک اک کر کے سب رستے کتنے سنسان ہوئے
یاد آیا میں لمبے سفر پر جانے والا تھا

○○○

جدا ہوئے وہ لوگ کہ جن کو ساتھ میں آنا تھا
اک ایسا موڑ بھی ہماری رات میں آنا تھا

تجھ سے بچھڑ جانے کا غم کچھ خاص نہیں ہم کو
ایک نہ اک دن کھوٹ ہماری ذات میں آنا تھا

آنکھوں کو یہ کہتے سنتے رہتے ہیں ہر دم
سوکھے کو آنا تھا اور برسات میں آنا تھا

اک لمبی سنسان سڑک پر تنہا پھرتے ہیں
وہ آہٹ تھی، ہم کو نہ اس کی بات میں آنا تھا

اے یادو! تم ایسے کیوں اس وقت کہاں آئیں
کسی مناسب وقت نئے حالات میں آنا تھا

○○○

شام کی دہلیز تک آئی ہوا
اور پھر آگے نہ چل پائی ہوا

آنکھ اس منظر کو کیسے بھول جائے
پھول مرجھائے تو مرجھائی ہوا

خشک پتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا
شاخ سے اُتری تو پچھتائی ہوا

ریت پھیلی اور پھیلی دور دور
آسماں سے کیا خبر لائی ہوا

آئینے بے عکس ہیں، مدت ہوئی
دیکھ کے یہ، آنکھ بھر لائی ہوا

○○○

لمس و لذّت کے اثر میں آ گئے
دیکھ! پھر دیوار و در میں آ گئے

دور کی چیزیں خلا میں کھو گئیں
پاس کے منظر نظر میں آ گئے

جسم کو گندم مہک نے چھو لیا
پھول پھر دل کے شجر میں آ گئے

آ رہی ہے ننگے پاؤں چاندنی
بہرِ استقبال گھر میں آ گئے

خوف سے ہم کو رہائی مل گئی
ہم بھی اک دستِ ہنر میں آ گئے

○○○

دیکھ دریا کو کہ طغیانی میں ہے
تو بھی میرے ساتھ اب پانی میں ہے

نور یہ اُس آخری بوسے کا ہے
چاند سا کیا تیری پیشانی میں ہے

میں بھی جلدی میں ہوں کیسے بات ہو
تو بھی لگتا ہے پریشانی میں ہے

مدّعی سورج کا سارا شہر ہے
رات یہ کس کی نگہبانی میں ہے

سارے منظر ایک سے لگنے لگے
کون شامل میری حیرانی میں ہے

○○○

(سیّد حامد صاحب کی نذر)

ہوا کا زور ہی کافی بہانہ ہوتا ہے
اگر چراغ کسی کو جلانا ہوتا ہے

زبانی دعوے بہت لوگ کرتے رہتے ہیں
جنوں کے کام کو کر کے دکھانا ہوتا ہے

ہمارے شہر میں یہ کون اجنبی آیا
کہ روز خواب سفر پہ روانہ ہوتا ہے

کہ تو بھی یاد نہیں آتا یہ تو ہونا تھا
گئے دنوں کو سبھی کو بھلانا ہوتا ہے

اسی امید پہ ہم آج تک بھٹکتے ہیں
ہر ایک شخص کا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے

ہمیں اک اور بھری بزم یاد آتی ہے
کسی کی بزم میں میں جب مسکرانا ہوتا ہے

○○○

خموش رہنا ہے اے اہلِ درد یوں کب تک
رگِ گلو میں چبھے گی یہ موجِ خوں کب تک

بہت دنوں سے گذرگاہ خواب سونی ہے
سرائے شام یہاں اور میں رکوں کب تک

لبوں کے پاس سے ہو کر مجھے گزرنے دے
میں اپنے جسم کی سرگوشیاں سنوں کب تک

کسی نے کھول دیئے بادبان یادوں کے
تجھے پکاروں کہاں تک صدائیں دوں کب تک

ہر ایک شخص پہ تیرا گمان ہوتا ہے
یہ دیکھنا ہے کہ رہتا ہے یہ جنوں کب تک

○○○

آئینہ بن کے اسے خود میں اُترتا دیکھو
ہر بُنِ مو سے بلاؤں کو گزرتا دیکھو

تا کہ سرسبز ہوں پھر کھیتیاں آوازوں کی
نغمۂ جاں کو خلاؤں میں بکھرتا دیکھو

ریت بے فیض تھی، بے مہر مگر ریت نہ تھی
ریت کے غم میں بگولوں کو بپھرتا دیکھو

تابِ نظارہ ہے آنکھوں میں تو آنکھیں کھولو
شہر اک خوابوں کا، خوابوں میں اُبھرتا دیکھو

○○○

کہیں لکیروں کہیں دائروں میں بٹنے لگی
زمینِ خواب ہر اک آن کچھ سمٹنے لگی

طلسم ٹوٹنے والا ہی تھا کہ ہم نے سنا
ہوائے شہرِ وفا ایک نام رٹنے لگی

ہوس کی آنکھ سے جب جسم نے بغاوت کی
تو پھر وہ روح کا اک اک ورق الٹنے لگی

پہنچ ہی جائیں گے اب سورجوں کی دنیا تک
چٹان رات کی اپنی جگہ سے ہٹنے لگی

سنا تھا ہم کسی سیلاب کی امانت ہیں
یہ کیا ہوا کہ ندی آنسوؤں میں گھٹنے لگی

○○○

وحشتِ دل تھی کہاں کم کہ بڑھانے آئے
کس لیے یاد ہمیں بیتے زمانے آئے

دشت خالی ہوئے زنجیر ہوئے دیوانے
تھی خطا اتنی کہ کیوں خاک اڑانے آئے

کیا عجب رسم ہے، دستور بھی کیا خوب ہے یہ
آگ بھڑکائے کوئی، کوئی بجھانے آئے

وقت کی بات ہے یہ بھی کہ مکاں خوابوں کا
جس نے تعمیر کیا ہو وہی ڈھانے آئے

کوئی آسان نہیں ترکِ تعلق کرنا
بزمِ اغیار میں یاروں کو بھلانے آئے

نقش کچھ اب بھی سرِ جادۂ دل باقی ہیں
تیز آندھی سے کہو ان کو مٹانے آئے

○○○

ہر طرف اپنے کو بکھرا پاؤ گے
آئینوں کو توڑ کے پچھتاؤ گے

جب بدی کے پھول مہکیں گے یہاں
نیکیوں پر اپنی تم شرماؤ گے

سچ کو پہلے لفظ پھر لب دیں گے ہم
تم ہمیشہ جھوٹ کو جھٹلاؤ گے

پھیلتا جائے گا صحرائے سکوت
دور کی آواز بنتے جاؤ گے

ساری سمتیں بے کشش ہو جائیں گی
گھوم پھر کے پھر یہیں آ جاؤ گے

روح کی دیوار کے گرنے کے بعد
بے بدن ہو جاؤ گے، مر جاؤ گے

○○○

گرد کو کدورتوں کی دھو نہ پائے ہم
دل بہت اداس ہے کہ رو نہ پائے ہم

وجود کے چہار سمت ریگزار تھا
کہیں بھی خواہشوں کے بیج بو نہ پائے ہم

روح سے تو پہلے دن ہی ہار مان لی
بوجھ اپنے جسم کا بھی ڈھو نہ پائے ہم

دشت میں تو ایک ہم تھے اور کچھ نہ تھا
شہر کے ہجوم میں بھی کھو نہ پائے ہم

ایک خواب دیکھنے کی آرزو رہی
اسی لیے تمام عمر سو نہ پائے ہم

○○○

آہٹ جو سنائی دی ہے ہجر کی شب کی ہے
یہ رائے اکیلی میری نہیں ہے سب کی ہے

سنسان سڑک، سناٹے، اور لمبے سائے
یہ ساری فضا اے دل تیرے مطلب کی ہے

تری دید سے آنکھیں جی بھر کے سیراب ہوئیں
کس روز ہوا تھا ایسا، بات یہ کب کی ہے

تجھے بھول گیا کبھی یاد نہیں کرتا تجھ کو
جو بات بہت پہلے کرنی تھی، اب کی ہے

مرے سورج آ! مرے جسم پہ اپنا سایہ کر
بڑی تیز ہوا ہے سردی آج غضب کی ہے

○○○

یہ کیا ہوا کہ طبیعت سنبھلتی جاتی ہے
ترے بغیر بھی یہ رات ڈھلتی جاتی ہے

اُس اک افق پہ ابھی تک ہے اعتبار مجھے
مگر نگاہ مناظر بدلتی جاتی ہے

چہار سمت سے گھیرا ہے تیز آندھی نے
کسی چراغ کی لَو پھر بھی جلتی جاتی ہے

میں اپنے جسم کی سرگوشیوں کو سُنتا ہوں
ترے وصال کی ساعت نکلتی جاتی ہے

یہ دیکھو آ گئی میرے زوال کی منزل
میں رک گیا مری پرچھائیں چلتی جاتی ہے

○○○

بام و در کی قید سے مجھ کو رہا کس نے کیا
دشت کی وسعت کے حق میں فیصلہ کس نے کیا

جاگتے رہنے کی دولت دی تھی مجھ کو رات نے
نیند کی لذت سے لیکن آشنا کس نے کیا

ایک اک کر کے ہوئیں تاریک ساری بستیاں
تیرے ذمّے کام یہ، پاگل ہوا کس نے کیا

اے خدا میں تیرے ہونے سے بہت محفوظ تھا
تجھ سے مجھ کو منحرف تو ہی بتا کس نے کیا

میرے ساحل پہ کھڑے ہونے سے یوں شاکی نہ ہو
تیرا استقبال اے موجِ بلا کس نے کیا

○○○

نہیں ہے مجھ سے تعلق کوئی تو ایسا کیوں
کہ تو نے مڑ کے فقط اک مجھی کو دیکھا کیوں

میں اس سفر میں کہیں بھی نہ رکنے والا تھا
یہ اک درخت مرے راستے میں آیا کیوں

گذشتہ شام و سحر یاد تک نہیں آتے
ہوائے وقت مجھے تو نے اتنا بدلا کیوں

میں اجنبی تو نہ تھا شہر آرزو کے لیے
تمام عمر رہا پھر یہاں اکیلا کیوں

مری ان آنکھوں کو کب روشنی سے نسبت تھی
ازل سے میرے تعاقب میں ہے اندھیرا کیوں

غرور تشنہ لبی بھی نہیں رہا باقی
سراب دیکھ کے آیا خیال دریا کیوں

○○○

عمر کی لمبی مسافت ہر قدم کھلنے لگی
تیری پرچھائیں مرے ہمراہ کیوں چلنے لگی

تجھ کو آنا ہے تو اب اک یاد کی صورت میں آ
ہجر کی ساعت مرے گھر سے کہاں ٹلنے لگی

میں درندوں کی نظر سے بھی کبھی دیکھوں تجھے
کیا عجب ناپاک خواہش جسم میں پلنے لگی

کل مجھے جس نے سزا دی تھی کہ میں تنہا رہوں
اب وہی دنیا مری تنہائی سے جلنے لگی

دستکوں کی دھول سے اٹ جائے گی ساری زمیں
دیکھ میرے بام و در سے دھوپ پھر ڈھلنے لگی

○○○

سائے جب وقتِ شام ڈھلنے لگے
لوگ ملبوسِ غم بدلنے لگے

ایک منزل تمام بھی نہ ہوئی
اور نئے راستے نکلنے لگے

دھند کی زد میں پھر افق آیا
اشک آنکھوں میں پھر مچلنے لگے

بچ نہ پائے مآل کے غم سے
اہلِ دل ہم بھی ہاتھ ملنے لگے

جو جہاں ہے قدم جمائے رہے
کیا خبر کب زمین چلنے لگے

○○○

میں زندہ ہوں اس کا مجھ کو کچھ تو یقیں آئے
بے آبادِ مکانِ دل میں کوئی مکیں آئے

اب جو حال پہ مستقبل کا سایہ رہتا ہے
بچھڑے لوگوں کا احسان ہے یاد نہیں آئے

دھول بھری دوپہر سے رشتہ پھر سے قائم ہو
کوئی جتن کہ ختم خلا ہو اور زمیں آئے

یہ جو سفر کی سرشاری ہے کچھ دن اور رہے
آنا ہی ہے موڑ کوئی تو آگے کہیں آئے

○○○

کیسا ماضی تھا کیا ہے حال اپنا
دیکھنا تھا ہمیں زوال اپنا

اور بھی ہو گئے ہیں ہم تنہا
اک ذرا آیا تھا خیال اپنا

دشت ہو بازگشت سے آباد
کوئی دہرائے پھر سوال اپنا

یہ سفر ختم یوں نہیں ہوگا
راستہ بدلیں ماہ و سال اپنا

دیکھ ہم پھر جلا رہے ہیں چراغ
اے ہوا حوصلہ نکال اپنا

○○○

اس کو کسی کے واسطے بے تاب دیکھتے
ہم بھی کبھی یہ منظر نایاب دیکھتے

ساحل کی ریت نے ہمیں واپس بلا لیا
ورنہ ضرور حلقۂ گرداب دیکھتے

بارش کا لطف بند مکانوں میں کچھ نہیں
باہر نکلتے گھر سے تو سیلاب دیکھتے

آتی کسی کو راس شہادت حسینؑ کی
دنیا میں ہم کسی کو تو سیراب دیکھتے

راتوں کو جاگنے کے سوا اور کیا کیا
آنکھیں اگر ملی تھیں کوئی خواب دیکھتے

○○○

یہ کیا ہے محبت میں تو ایسا نہیں ہوتا
میں تجھ سے جدا ہو کے بھی تنہا نہیں ہوتا

اس موڑ سے آگے بھی کوئی موڑ ہے ورنہ
یوں میرے لیے تو کبھی ٹھہرا نہیں ہوتا

کیوں میرا مقدر ہے اجالوں کی سیاہی
کیوں رات کے ڈھلنے پہ سویرا نہیں ہوتا

یا اتنی نہ تبدیل ہوئی ہوتی یہ دنیا
یا میں نے اسے خواب میں دیکھا نہیں ہوتا

سنتے ہیں سبھی غور سے آوازِ جرس کو
منزل کی طرف کوئی روانہ نہیں ہوتا

دل ترکِ تعلق پہ بھی آمادہ نہیں ہے
اور حق بھی ادا اس سے وفا کا نہیں ہوتا

○○○

شام تک جب کوئی گھر آتا نہ تھا
چین دل کو رات بھر آتا نہ تھا

بند رکھتے اپنی آنکھیں ہم سبھی
چاند جب تک بام پر آتا نہ تھا

دور تک چلتے تھے صحراؤں میں ہم
دیر تک کوئی شجر آتا نہ تھا

اک افق پہ جا کے رک جاتی نگاہ
اور پھر کچھ بھی نظر آتا نہ تھا

دشت تنہائی کا وہ لمبا سفر
یاد کوئی ہم سفر آتا نہ تھا

صرف افسردہ دلی کو کیا کہیں
ہم کو جینے کا ہنر آتا نہ تھا

○○○

سب کہیں گے کہ نہ دیکھا تھا تماشا ایسا
رنگ بدلے گی کسی روز یہ دنیا ایسا

ایک کرن نور کی مانگی تھی سزا اس کی ہے
جو نظر آتا ہے ہر سمت اندھیرا ایسا

جی یہ چاہے کہ کہیں سایۂ دیوار ملے
اس سفر میں تو کوئی موڑ نہ آیا ایسا

ایسی بارش تو کئی بار ہوئی تھی پہلے
کیا غضبناک ہوا تھا کبھی دریا ایسا

جس کی تعمیر تصور میں بھی ناممکن ہے
دل نے نقشہ ہی بنا رکھا ہے گھر کا ایسا

○○○

بند دروازوں کو جب جب دستکیں سہلائیں گی
بھولی بسری ساری باتیں دیر تک یاد آئیں گی

ناؤ کاغذ کی بنانے میں ہیں بچے منہمک
پانیوں سے یہ ڈھکی سڑکیں کہاں تک جائیں گی

کون ان کے واسطے روشن کرے گا راستے
ہم سے بچھڑیں گی تو یہ پرچھائیاں پچھتائیں گی

عکس اک ٹھہرا ہوا ہے کب سے سطحِ آب پر
تیز طوفانی ہوائیں کب ادھر کو آئیں گی

○○○

کاروبارِ شوق میں بس فائدہ اتنا ہوا
تجھ سے ملنا تھا کہ میں کچھ اور بھی تنہا ہوا

کوئی پلکوں سے اترتی رات کو روکے ذرا
شام کی دہلیز پر اک سایہ ہے سہما ہوا

منجمد ہوتی چلی جاتی ہیں آوازیں تمام
ایک سناٹا ہے سارے شہر میں پھیلا ہوا

آسمانوں پر لکھی تحریر دھندلی ہو گئی
اب کوئی مصرف نہیں آنکھوں کا یہ اچھا ہوا

اس ہتھیلی میں بہت سی دستکیں روپوش ہیں
اس گلی کے موڑ پر اک گھر تھا کل تک کیا ہوا

○○○

دیکھتے ہی دیکھتے ہر شئے یہاں فانی ہوئی
لمحۂ آئندہ کو کتنی پشیمانی ہوئی

لوگ کہتے ہیں کہ کل یہ شہر بھی آباد تھے
حکمراں کب اور کیسے ان پہ ویرانی ہوئی

معجزوں کی منتظر آنکھیں رہیں شام و سحر
اس زمانے میں ہمیں سے بس یہ نادانی ہوئی

تم کو اس بے بادباں کشتی پہ کتنا ناز ہے
وہ اُدھر دیکھو ندی کچھ اور طوفانی ہوئی

ہر قدم پر موڑ تھے، ہر موڑ پر منظر نئے
عمر کی اک ایک ساعت صرفِ حیرانی ہوئی

○○○

بڑھا دے مری وحشتیں چاک میرا گریبان کر دے
کوئی ہے جو یہ زندگی کا سفر مجھ پہ آسان کر دے

مجھے نیند مت دے کہ میں خواب سے منحرف ہو گیا ہوں
مگر رات بھر جاگنے کے لیے کوئی سامان کر دے

مرے دل کے اجڑے مکاں کو مکینوں سے محروم رکھا
بہت ہو چکا اب کسی شخص کو اس میں مہمان کر دے

مری رات کیوں اتنی تاریک ہوتی چلی جا رہی ہے
سبب اس کا کچھ بھی نہیں، میں ہوں، یہ کہہ کے حیران کر دے

دکھائی نہ دی آج تک دیکھنے کو جہاں دیکھ ڈالا
کوئی شکل ایسی کہ جو آئینوں کو پشیمان کر دے

○○○

منظر گذشتہ شب کے دامن میں بھر رہا ہے
دل پھر کسی سفر کا سامان کر رہا ہے

یا رتجگوں میں شامل کچھ خواب ہو گئے ہیں
چہرہ کسی افق کا یا پھر اُبھر رہا ہے

یا یونہی میری آنکھیں حیران ہو گئی ہیں
یا میرے سامنے سے پھر تو گزر رہا ہے

دریا کے پاس دیکھو کب سے کھڑا ہوا ہے
یہ کون تشنہ لب ہے پانی سے ڈر رہا ہے

ہے کوئی جو بتائے شب کے مسافروں کو
کتنا سفر ہوا ہے کتنا سفر رہا ہے

○○○

موم کے جسموں والی اس مخلوق کو رسوا مت کرنا
مشعلِ جاں کو روشن کرنا لیکن اتنا مت کرنا

حق گوئی اور وہ بھی اتنی جینا دوبھر ہو جائے
جیسا کچھ ہم کرتے رہے ہیں تم سب ویسا مت کرنا

پچھلے سفر میں جو کچھ بیتا، بیت گیا یارو لیکن
اگلا سفر جب بھی تم کرنا دیکھو تنہا مت کرنا

بھوک سے رشتہ ٹوٹ گیا تو ہم بے حس ہو جائیں گے
اب کے جب بھی قحط پڑے تو فصلیں پیدا مت کرنا

اے یادو جینے دو ہم کو بس اتنا احسان کرو
دھوپ کے دشت میں جب ہم نکلیں ہم پر سایا مت کرنا

○○○

عشق کہیے کہ ہوس اس کی بدولت کچھ ہے
راکھ کے ڈھیر میں چنگاری کی صورت کچھ ہے

عمر بھر مَیں کبھی سیراب نہیں ہو سکتا
چشمِ جاناں میں ہے کچھ میری ضرورت کچھ ہے

میری تنہائی سے جلتی ہے مری دشمن ہے
پوچھے دنیا سے کوئی مجھ سے عداوت کچھ ہے

تیز آندھی میں اندھیروں کے ستم سہتے رہے
رات کو پھر بھی چراغوں سے شکایت کچھ ہے

میری بربادی میں کچھ ہاتھ نہیں ہے تیرا
مجھ کو بھی کہنے کی اے دوست اجازت کچھ ہے

زندگی سے ابھی رشتہ نہیں ٹوٹا میرا
کل کا احوال تھا کچھ، آج کی حالت کچھ ہے

آج کی رات میں گھوموں گا کھلی سڑکوں پر
آج کی رات مجھے خوابوں سے فرصت کچھ ہے

○○○

کہاں تک وقت کے دریا کو ہم ٹھہرا ہوا دیکھیں
یہ حسرت ہے کہ ان آنکھوں سے کچھ ہوتا ہوا دیکھیں

بہت مدّت ہوئی یہ آرزو کرتے ہوئے ہم کو
کبھی منظر کہیں ہم کوئی ان دیکھا ہوا دیکھیں

سکوتِ شام سے پہلے کی منزل سخت ہوتی ہے
کہو لوگوں سے سورج کو نہ یوں ڈھلتا ہوا دیکھیں

ہوائیں بادباں کھولیں لہو آثار بارش ہو
زمینِ سخت تجھ کو پھولتا پھلتا ہوا دیکھیں

دھوئیں کے بادلوں میں چھپ گئے اجلے مکاں سارے
یہ چاہا تھا کہ منظر شہر کا بدلا ہوا دیکھیں

ہماری بے حسی پہ رونے والا بھی نہیں کوئی
چلو جلدی چلو پھر شہر کو جلتا ہوا دیکھیں

○○○

سفر یہ ختم ہو جائے نہیں ایسا نہیں ہو گا
بہت ہو گا تو ان اشجار کا سایہ نہیں ہو گا

تمھیں اس درجہ کیوں ہوتی کسی سیلاب کی خواہش
تمھارے شہر کے اطراف میں دریا نہیں ہو گا

کہاں کس موڑ پر ہوں گے جدا ہم لوگ خوابوں سے
چلو دیکھیں کہ منظر رات کا بدلا نہیں ہو گا

رگوں میں سب کی اب تک برف کی تہ جم چکی ہو گی
خدا کا شکر ہم میں کوئی بھی رسوا نہیں ہو گا

ہمارے غم میں ناحق دوست دُبلے ہوتے جاتے ہیں
مرض جو ہم کو لاحق ہے کبھی اچھا نہیں ہو گا

○○○

کتنا باقی ہے سفر اہل جنوں کا دیکھو
دشت تو ختم ہوا شہر کا نقشا دیکھو

میرے ہمراہ ابھی تک مری پرچھائیں ہے
تم نے چاہا تو بہت مجھ کو اکیلا دیکھو

کتنی تبدیل ہوئی کس لیے تبدیل ہوئی
جاننا چاہو تو ان آنکھوں سے دنیا دیکھو

یہ نہیں ہوگا مگر دل میں ہے حسرت اب بھی
ایسا کچھ ہو کہ کبھی تم مرا رستا دیکھو

ooo

یہ قافلے یادوں کے کہیں کھو گئے ہوتے
اک پل بھی اگر بھول سے ہم سو گئے ہوتے

اے شہر ترا نام و نشاں بھی نہیں ہوتا
جو حادثے ہونے تھے اگر ہو گئے ہوتے

ہر بار پلٹتے ہوئے گھر کو یہی سوچا
اے کاش کسی لمبے سفر کو گئے ہوتے

ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراثت میں ملی ہے
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

کس منھ سے کہیں تجھ سے سمندر کے ہیں حقدار
سیراب سرابوں سے بھی ہم ہو گئے ہوتے

○○○

نہیں ہے جو صحرا در و بام دے
میں خالی ہوں مجھ کو کوئی کام دے

ترے دشت وسعت سے محروم تھے
مری وحشتوں کو نہ الزام دے

کسے چاہیے رتجگوں کا صلہ
کہا کس نے نیندوں کا انعام دے

جہاں تک سفر میرا جاری رہے
وہاں تک سکوتِ سر شام دے

یہ کم معجزہ ہے مرے خواب کا
حقیقت کا تو بھی اسے نام دے

○○○

کب سماں دیکھیں گے ہم زخموں کے بھر جانے کا
نام لیتا ہی نہیں وقت گزر جانے کا

جانے وہ کون ہے جو دامنِ دل کھینچتا ہے
جب کبھی ہم نے ارادہ کیا مر جانے کا

دستبردار ابھی تیری طلب سے ہو جائیں
کوئی رستہ بھی تو ہو لوٹ کے گھر جانے کا

لاتا ہم تک بھی کوئی نیند سے بوجھل راتیں
آتا ہم کو بھی مزہ خواب میں ڈر جانے کا

سوچتے ہی رہے، پوچھیں گے تری آنکھوں سے
کس سے سیکھا ہے ہنر دل میں اتر جانے کا

○○○

نظر جو کوئی بھی تجھ سا حسیں نہیں آتا
کسی کو کیا مجھے خود بھی یقیں نہیں آتا

ترا خیال بھی تیری طرح ستم گر ہے
جہاں پہ چاہیے آنا وہیں نہیں آتا

جو ہونے والا ہے اب اس کی فکر کیا کیجے
جو ہو چکا ہے اسی پر یقیں نہیں آتا

یہ میرا دل ہے کہ منظر اجاڑ بستی کا
کھلے ہوئے ہیں سبھی در مکیں نہیں آتا

بچھڑنا ہے تو بچھڑ جا اسی دوراہے پر
کہ موڑ آگے سفر میں کہیں نہیں آتا

OOO

تو کہاں ہے تجھ سے اک نسبت تھی میری ذات کو
کب سے پلکوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں رات کو

میرے حصے کی زمیں بنجر تھی میں واقف نہ تھا
بے سبب الزام میں دیتا رہا برسات کو

کیسی بستی تھی جہاں پر کوئی بھی ایسا نہ تھا
منکشف میں جس پہ کرتا اپنے دل کی بات کو

ساری دنیا کے مسائل یوں مجھے درپیش ہیں
تیرا غم کافی نہ ہو جیسے گذر اوقات کو

○○○

یہ جب ہے کہ اک خواب سے رشتہ ہے ہمارا
دن ڈھلتے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے ہمارا

چہروں کے سمندر سے گزرتے رہے پھر بھی
اک عکس کو آئینہ ترستا ہے ہمارا

ان لوگوں سے کیا کہیے کہ کیا بیت رہی ہے
احوال مگر تو تو سمجھتا ہے ہمارا

ہر موڑ پہ پڑتا ہے ہمیں واسطہ اس سے
دنیا سے الگ کہنے کو رستہ ہے ہمارا

○○○

ہم کو جس دن نہ زمانے سے شکایت ہوگی
خود سے شرم آئے گی یا تجھ سے ندامت ہوگی

ایک دن آئے گا جب آنکھیں ہی آنکھیں ہوں گی
اور ہر آنکھ میں بیداری کی لذّت ہوگی

کِس کی دستک ہے کہ دروازے کو سہلاتی ہے
اور کون آئے گا یاں، ہجر کی ساعت ہوگی

وہ اُدھر اوس کی اک بوند نظر آتی ہے
جانے کس شخص کی پلکوں کی امانت ہوگی

مٹھیاں ریت سے بھر لو کہ سمندر میں تمھیں
اک نہ اک روز جزیروں کی ضرورت ہوگی

○○○

خوں میں لت پت ہو گئے سائے بھی اشجار کے
کتنے گہرے وار تھے خوشبو کی تلوار کے

اک لمبی چپ کے سوا بستی میں کیا رہ گیا
کب سے ہم پر بند ہیں دروازے اظہار کے

آؤ اٹھو کچھ کریں صحرا کی جانب چلیں
بیٹھے بیٹھے تھک گئے سائے میں دیوار کے

رستے سونے ہو گئے دیوانے گھر کو گئے
ظالم لمبی رات کی تاریکی سے ہار گئے

بالکل بنجر ہو گئی دھرتی دل کے دشت کی
رخصت کب کے ہو گئے موسم سارے پیار کے

○○○

غبار شام سے آگے کی منزلوں تک ہے
سفر کا نشہ بھی انجانے فاصلوں تک ہے

نقوشِ پا سے منور ہیں سب گذرگاہیں
مگر یہ بات بھی خوابوں کے قافلوں تک ہے

عروج شعلہء خس دیکھ کے نہ گھبراؤ
رسائی اس کی فقط برف کی سلوں تک ہے

رہے گا دشتِ وفا بازگشت سے آباد
پہنچ صدائے جنوں کی دکھی دلوں تک ہے

یہ سوچتا تھا کہ ہم لوگ پھر اداس ہوئے
کہ بے کنار سمندر بھی ساحلوں تک ہے

○○○

تلاش جس کی رہی ہم کو عمر بھر کیا تھا
زمیں پہ کچھ بھی نہ تھا آسمان پر کیا تھا

ہوس کے زہر کی ہر بوند پی چکے تھے ہم
رگوں میں جمتی ہوئی ریت سے مفر کیا تھا

ہمارا عکس بھی بے عکس آئینوں میں تھا
سبب ضرور تھا اس کا کوئی مگر کیا تھا

یہ سوچنے کی بھی مہلت نہیں ملی ہم کو
خیال و خواب کی دیوار سے ادھر کیا تھا

اب ایک ہم ہیں ہمارے طویل سائے ہیں
کوئی بتاؤ کہ دنیا میں پیشتر کیا تھا

○○○

لہو کی بوند خزاں کا خیال سب میں ہوں
زمیں پہ بکھرا ہوا دور پاس اب میں ہوں

میں اپنی آنکھ کو کیوں بند کر نہیں لیتا
ہر ایک شخص کی رسوائی کا سبب میں ہوں

مرا قصور ہے میں منحرف ہوں خوابوں سے
بہت اکیلا سر رہگذار شب میں ہوں

بدی کے پھول مہکنے کا یہ نہیں موسم
حصار جسم کے اطراف بے سبب میں ہوں

شمار شام و سحر سے بھی بے نیاز رہوں
فنا کے کھیل میں مشاق اتنا کب ہوں میں

○○○

ٹوٹی پھوٹی کشتیاں، دریا میں گرداب ہیں
جینے مرنے کے لیے یہ لمحے نایاب ہیں

اک ننھا سا دائرہ بنتے بنتے رہ گیا
اس منظر کے بعد بھی آنکھوں میں سیلاب ہیں

چٹانیں، آنسو، عدو، آوازیں، خوشبو، لہو
وہ بھی سب ہیں واہمے، یہ بھی دن کے خواب ہیں

دوری کی دیوار میں روزن کر کے دیکھ لیں
ان کا کیا احوال ہے، وہ کتنے بیتاب ہیں

اس پر روئیں یا ہنسیں، ایسا لگتا ہے ہمیں
جیسے وہ پیاسے نہیں جیسے ہم سیراب ہیں

○○○

رگوں میں برف جمی، بے حسی سی طاری ہوئی
کہ یاد آنے لگیں ساعتیں گزاری ہوئی

سماں تھا حشر کا ان بے چراغ گلیوں میں
دیارِ خواب پہ جس رات سنگ باری ہوئی

ہمیشہ رہنا تھا بے فصل ان زمینوں کو
بلا سبب ہی ندی آنسوؤں کی جاری ہوئی

وہ بڑھ رہی ہے اندھیروں کی سلطنت ہر پل
وہ آ رہی ہے اجالوں کی فوج ہاری ہوئی

بچھا گئی ہے ہر اک راستے پہ سناٹے
ہوائے درد سے کیوں دشمنی ہماری ہوئی

○○○

راتیں لوگو سنو بے کراں ہو گئیں
مشعلیں جتنی تھیں سب دھواں ہو گئیں

کتنے دلکش بلاوے تھے صحراؤں کے
دور کچھ اور بھی بستیاں ہو گئیں

ہم سفر کی صعوبت سے بے حال تھے
اس پہ ہمراہ پرچھائیاں ہو گئیں

دھوپ معمول سے کچھ سوا تیز تھی
تیری پلکیں مگر سائباں ہو گئیں

سخت بنجر زمینوں کا احسان ہے
ندیاں آنسوؤں کی رواں ہو گئیں

عشقِ صادق کی اتنی سی روداد ہے
قربتیں جب بڑھیں دوریاں ہو گئیں

○○○

جینے کے الزام سب ہم نے اپنے سر لیے
جھولی جب خالی ہوئی کنکر پتھر بھر لیے

تنہا تنہا خواب کی وادی میں پھرتے رہے
ان دیکھی دنیاؤں کے باشندوں کا ڈر لیے

خوشبو کی آواز کا جادو آخر چل گیا
سب نے آنکھیں کھول لیں دروازے وا کر لیے

اجڑے شہروں کی طرف اب کوئی جاتا نہیں
سب نے اپنے واسطے صحرا پیدا کر لیے

چکھا ہم نے پیار کے ہر موسم کا ذائقہ
وصل آیا تو جی اٹھے ہجر آیا تو مر لیے

○○○

ہوائے کوئے جاناں صرف اتنا کام کر جانا
صراحی دل کی جب خالی ہو اس کو خوں سے بھر جانا

مہک نے خوشہء گندم کی کیا دیوانہ کیا تم کو
یہ سچ ہے پھر بھی تم اپنی حدوں سے مت گزر جانا

تمہاری مٹھیوں میں ریت ہے وہ بھی سرابوں کی
تم اب تک کس لیے زندہ ہو کیوں چاہا نہ مر جانا

جہاں اشلوک پڑھتی اجنبی پرچھائیاں دیکھو
وہیں ان کشتیوں سے خواب کی تم سب اتر جانا

بہت یاد آئے جب جب قہر سورج کا ہوا نازل
وہی اشجار جن کو ہم نے بے برگ و ثمر جانا

○○○

نشاں یوں تو تھے رہگذر میں بہت
مگر موڑ تھے اس سفر میں بہت

میں اپنے کو پہچانتا کس طرح
کہ آئینے تھے میرے گھر میں بہت

کبھی میں ہَوا تھا، بگولہ کبھی
رہا وحشتوں کے اثر میں بہت

میسر نہ تنہائی مجھ کو ہوئی
کہ روزن تھے دیوار و در میں بہت

بہت دور تجھ سے کبھی میں نہ تھا
مگر دن لگے تھے سفر میں بہت

○○○
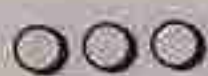
منجمد لمحوں کی تصویر بدلنے کے لیے
عذر کوئی ملے آنکھوں کو مچلنے کے لیے

رات بھی ختم ہوئی سایا بھی معدوم ہوا
اب کوئی چیز بھی باقی نہیں ڈھلنے کے لیے

مدتیں ہو گئیں سورج نہیں نکلا کوئی
شہر کا شہر ہے بے چین پگھلنے کے لیے

پھر بلایا ہے ہمیں دشتِ فراموشی نے
کوئی آمادہ ہے کیا ساتھ میں چلنے کے لیے

مشعلِ جاں پہ کوئی ناز کرے کیا کہ اسے
تیز آندھی کی ضرورت رہی جلنے کے لیے

○○○

درد سا اک جو دل کے اندر ہے
سب کو یہ بھی کہاں میسر ہے

وہ اُدھر اُس طرف ذرا دیکھو
ایک پرچھائیں اوس سے تر ہے

راہ جیسے صلیب کا سایہ
نقشِ پا جیسے کوئی خنجر ہے

پتیاں ہیں نہ پھول پیڑوں پر
حکمراں دور دور صرصر ہے

بے افق آسمان تک تھی پہنچ
آنکھ کی زد سے وہ بھی باہر ہے

منحرف خوابوں سے ہوئے جب لوگ
سوئیں یا جاگیں سب برابر ہے

چپ ہیں اب بولتے نہیں ہم بھی
ہاں ہمیں بازگشت کا ڈر ہے

○○○

بے سبب اور تری یاد نہیں آئی تھی
ایک دو بار طبیعت ذرا گھبرائی تھی

صف بہ صف ایسے ہی اترے تھے ستارے دل میں
ہو بہو ایسی ہی کل بھی شبِ تنہائی تھی

تیرے ہی کہنے پہ میں نے یہ عمارت دل کی
بڑی مشکل سے بڑے شوق سے بنوائی تھی

اک یہی شکل تھی زخموں پہ بہار آنے کی
کام کی چیز بڑی، اب کھلا، تنہائی تھی

مجھ کو رہنا تھا اسی شہر کی گلیوں میں اسیر
میرے حصّے میں کہاں دشت کی پہنائی تھی

کیسا منظر تھا کہ زنجیر ہوئیں آوازیں
اور مخلوقِ خدا ساری، تماشائی تھی

○○○

موسم کی افتاد سہے جاتے ہیں سب
پھول شگوفے زرد ہوئے جاتے ہیں سب

چٹانوں کی قید سے دریا اوبھ گئے
گاؤں، جزیرے، شہر بہے جاتے ہیں سب

دیکھتے دیکھتے آنکھیں بھی بے نور ہوئیں
چاند، چراغ، نقوش بجھے جاتے ہیں سب

اپنی تلاش کی آخری منزل سَر کرنے
شہرِ ہوس کی سمت بڑھے جاتے ہیں سب

کس نے ہوا کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا
منکرِ لذتِ مرگ ہوئے جاتے ہیں سب

کس کے لہو کی چیخ کی گونج فضا میں ہے
کس کے سراغ میں چلتے چلے جاتے ہیں سب

کیا صورت ہو ساتویں در کے کھلنے کی
دستک دیتے دیتے تھکے جاتے ہیں سب

ooo

دشت میں پہنچے نہ گھر میں آئے
کن بلاؤں کے اثر میں آئے

قہر آندھی کا ہوا ہے نازل
پھول پھل پھر بھی شجر میں آئے

کب سے بے عکس ہے آئینۂ چشم
کوئی تصویر نظر میں آئے

کتنی حسرت تھی کہ سیاح کوئی
دل کے اس اجڑے نگر میں آئے

قافلہ دل کا کہیں تو ٹھہرے
کوئی منزل تو سفر میں آئے

خاک جب چھان چکے دنیا کی
ہم تری راہگذر میں آئے

○○○
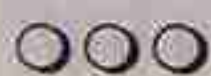
ہنس رہا تھا میں بہت گو وقت وہ رونے کا تھا
سخت کتنا مرحلہ تجھ سے جدا ہونے کا تھا

رتجگے تقسیم کرتی پھر رہی ہیں شہر میں
شوق جن آنکھوں کو کل تک رات میں سونے کا تھا

اس سفر میں بس مری تنہائی میرے ساتھ تھی
ہر قدم کیوں خوف مجھ کو بھیڑ میں کھونے کا تھا

ہر بُنِ مو سے درندوں کی صدا آنے لگی
کام ہی ایسا بدن میں خواہشیں بونے کا تھا

میں نے جب سے یہ سنا ہے خود سے بھی نادم ہوں میں
ذکر تجھ ہونٹوں پہ میرے دربدر ہونے کا تھا

○○○

ساتھ ان کے ہی بسر آج بھی شب کرنا ہے
جو نہیں جانتے کیا کرنا ہے کب کرنا ہے

رات یہ ہجر کی ہے اور بہت لمبی ہے
خواب، بیداری، کہو کس کو طلب کرنا ہے

اتفاق اہلِ زمانہ سے، جنوں سے انکار
پہلے سوچا بھی نہیں تھا جسے اب کرنا ہے

دوریاں قرب لگیں، قرب میں دوری نکلے
عمر بھر مجھ کو یہی کارِ عجب کرنا ہے

ایک مدت سے مری پیاس یہی سنتی ہے
انتظار اور سرِ چشمۂ لب کرنا ہے

○○○

بلا سبب نہیں بیزار آسمان سے ہم
خرید لائے ہیں کچھ خواب اک دکان سے ہم

تمام عمر مگر اضطراب میں گزری
مثالِ تیر نکل آئے ہر کمان سے ہم

ہوا کے ہاتھ نے مسمار کر دیا اس کو
سروں کو پھوڑنے نکلے تھے جس چٹان سے ہم

اسی لیے ہمیں جینے کی تھی ہوس شاید
تمہارا نام سنیں، غیر کی زبان سے ہم

سمندروں کا سفر ختم ہو گیا ہوتا
جدا نہ کرتے جو کشتی کو بادبان سے ہم

○○○

کاغذ کی اک ناؤ میں بچے بیٹھے ہیں
خوش خوش اک سیلاب کو دیکھنے نکلے ہیں

ساکت ہیں چپ ہیں آسیب زدہ اشجار
دشمن خواب ادھر سے ہو کے گزرے ہیں

بستی والو! وہ جو یار ہمارے تھے
ان کا کیا احوال ہے اب وہ کیسے ہیں

بنجر راتوں میں خوابوں کی فصلوں کا
جو انجام ہوا تھا ہم کب بھولے ہیں

دشتِ جنوں سے ہم کو بُلاوا آیا ہے
ابھی ابھی تو ایک سفر سے لوٹے ہیں

○○○

تیرے وعدے کو کبھی جھوٹ نہیں سمجھوں گا
آج کی رات بھی دروازہ کھلا رکھوں گا

دیکھنے کے لیے اک چہرہ بہت ہوتا ہے
آنکھ جب تک ہے تجھے صرف تجھے دیکھوں گا

میری تنہائی کی رسوائی کی منزل آئی
وصل کے لمحے سے میں ہجر کی شب بدلوں گا

شام ہوتے ہی کھلی سڑکوں کی یاد آتی ہے
سوچتا روز ہوں میں گھر سے نہیں نکلوں گا

تاکہ محفوظ رہے میرے قلم کی حرمت
سچ مجھے لکھنا ہے میں حسن کو سچ لکھوں گا

○○○

چھوٹ کر تجھ سے مرا حال بتا کیا ہوتا
جیسا سمجھا تھا اگر تو کہیں ویسا ہوتا

یہ تو اچھا ہوا تائب ہوا میں وحشت سے
ورنہ اب شہر جہاں ہے وہاں صحرا ہوتا

ٹوٹ کر ملنا کبھی ہفتوں نہ دکھلانا شکل
چند دن اور یہ سب رہتا تو اچھا ہوتا

سچ یہی ہے کہ اگر چوٹ نہ کھاتا یہ دل
خوش تو کیا ہوتا پہ غمگین نہ اتنا ہوتا

زندہ رہنے کے سوا کام نہیں کچھ میرا
فرق کیا پڑتا جو یہ میں نے نہ جانا ہوتا

○○○

(رزمی رضوان کی یاد میں)

عہدِ گل کا کوئی قصہ نہ سُنائیں گے تمھیں
تم بہت جاگ چکے اب نہ جگائیں گے تمھیں

تھی کشش وسعتِ افلاک میں ہم سے بھی سوا
ورنہ سوچا تھا کہ اس دل میں بسائیں گے تمھیں

وقت رخصت تمھیں اک بار نہ دیکھا مڑ کے
گرچہ معلوم تھا ہم بھول نہ پائیں گے تمھیں

تم پہ کیا گزرے گی یہ سوچ کے جی ڈرتا ہے
ہم کہ جب بھیڑ میں تنہا نظر آئیں گے تمھیں

سر برہنہ ہیں سبھی پیڑ ہوا چپ چپ ہے
اور سبب کیا ہے ابھی یہ نہ بتائیں گے تمھیں

نظمیں

صدائے شب

اتنے سارے بند دروازوں پہ دستک دے کے آئی ہے
ذرا آرام کر
یہ نہیں ہے لفظ بے تاثیر ہیں
لوگ سارے نیند میں زنجیر ہیں
ان سے خوابوں کے علاقے چھن چکے ہیں
اپنے حصے کے وہ تارے گن چکے ہیں
کس نئے سیلاب کے مژدے سے تو سرشار ہے
شہر سارا تجھ سے گر بیزار ہے
مجھ پہ ہی اکرام کر
پہلے اتنا کام کر
میرے گھر کے سارے دروازوں کو اک اک کر کے کھول
میری تنہائی میں اپنا زہر گھول
پھر نئے سیلاب کا مژدہ سنا
بھولے بسرے خواب کا چہرہ دکھا
مجھ پہ یہ اکرام کر
اتنے سارے بند دروازوں پہ دستک دے کے آئی ہے
ذرا آرام کر

بہادروں کی واپسی

دیکھو کہ شامِ ہجراں
دیوار بن گئی ہے
بولو کہ شاخِ گُل کی
تلوار بن گئی ہے

اُٹھو کہ فاصلوں کی
زنجیریں توڑ ڈالیں
صحراؤں کی حدوں سے
اپنی حدیں ملا لیں

خوابوں کی رہگذر سے
لوٹ آئے ہیں سفر سے
وہ بے سپر بہادر
جن کی ہتھیلیوں سے
سورج طلوع ہوں گے

فیصلے کی گھڑی

بارشیں پھر زمینوں سے ناراض ہیں
اور سمندر بھی خشک ہیں
کھردری، سخت، بنجر زمینوں میں کیا بویئے اور کیا کاٹیے
آنکھ کی اوس کے چند قطروں سے کیا ان زمینوں کو
سیراب کر پاؤ گے
گندم و جو کے خوشوں کی خوشبو تمھارا مقدر نہیں
آسمانوں سے تم کو رقابت رہی
اور زمینوں سے تم بے تعلق رہے
ریڑھ کی ایک ہڈی پہ تم کو بہت ناز تھا
یہ گماں بھی نہ تھا
ایک دن بے لہو یہ بھی ہو جائے گی
فیصلے کی گھڑی آ گئی کچھ کرو
تتلیوں کے سنہرے، ہرے، سرخ، نیلے پروں کے لیے
آنکھ کی اوس کے چند قطروں سے بنجر زمیں کے
کسی گوشے میں
پھول پھر سے اگانے کی کوشش کرو

نفی سے اثبات تک

رات کا یہ سمندر تمھارے لیے
تم سمندر کی خاطر بنے ہو
دلوں میں کبھی خشکیوں کی سحر کا تصور نہ آئے
اسی واسطے تم کو بے بادباں کشتیاں دی گئی ہیں
سفر، رات کے اس سمندر کی گہرائیوں کا سفر، بیکراں ہے
اکیلے ہو تم اور اکیلے رہو گے
مگر آسماں کی جگہ آسماں اور زمیں کی جگہ یہ زمیں
تم سے قائم ہے
دائم ہے یہ رات
اور اس رات کے تم امیں ہو
اگر آنکھ میں نور کا کوئی منظر ہے
اس کی حفاظت کرو

خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں

(۱)

اب سفر کر چکو موقوف
ذرا دم لے لو
پاؤں کی گرد کی ہر تہ سے
اجازت مانگو
ان ببولوں کے تلے بیٹھ کے
بس یہ سوچو
کس کی آواز تھی
کیوں اس نے بلایا تھا تمھیں
دشتِ تنہائی کی بھی آخری حد آ پہنچی

(۲)

تمھاری ہجرت کے سارے موسم گزر چکے ہیں
یہاں سے آگے کی منزلوں کا خیال چھوڑو
یہ ملزموں کے سجے کٹہرے
کسی نمائش کے واسطے ہیں
یہی بہت ہے
سروں پہ نفرت بھری ہواؤں کے سائباں ہیں
کہ آج سورج کی زرد آنکھوں میں خون سا ہے
یہاں سے آگے جو موڑ آئے
وہیں پہ خیموں کو گاڑ دینا
وہیں پہ چیلیں تمھیں ملیں گی
وہیں پہ تم لوگ چیونٹیوں کی غذا بنو گے
وہاں سے آگے نہ بڑھ سکو گے
کہ اس کی خوشبو کی دھند سمتوں پہ چھا گئی ہے

(۳)

ہرے پیڑ کی ساری شاخیں
پت جھڑ کے آنے کا مژدہ دیتی ہیں
سارے پتے اک اک کر کے
زرد دنوں سے مل جائیں گے
آنکھوں میں جتنے آنسو ہیں
پلکوں سے باہر آ جائیں
یہ منظر کتنا اچھا ہے
ہم نے صدیوں میں دیکھا ہے

(۴)

بہار کے دنوں کی یاد
دھوپ میں جھلس گئی
کہ زرد پھول دور دور کھل اٹھے
زمیں پہ اب کوئی جگہ نہیں بچی
کہاں پہ خواہشوں کے بیج بوؤں میں
مجھے تو بس اس ایک فیصلے کا اختیار ہے
ہنسوں کہ اور روؤں میں

چوکور زمیں گول ہُوئی

چوکور زمیں گول ہوئی
پاس کے منظر
دھندلانے لگے، دور ہوئے
آنکھ کی سرحد
اک ٹوٹتی دیوار ہوئی
وہ بھی خلا میں

ہم اپنی صدا میں
آوازیں کئی اور بھی سنتے ہیں
ہوا میں
اک زہر ہے
اس زہر سے کیا تشنگی جسم بجھالیں

پلکوں پہ سجا لیں
ان قطروں کو
جو آنکھ سے ٹپکے نہیں اب تک
چوکور زمیں گول ہوئی
خواب کے پیکر
دھندلانے لگے دور ہوئے
آنکھ کی سرحد
اک ٹوٹتی دیوار ہوئی
وہ بھی خلا میں

خواہشوں کا قہر

خواہشوں کے قہر سے
جسم کی دیوار میں
سیکڑوں روزن ہوئے

ایک طرف خوف کی
چھوٹی بڑی ندیاں
ایک طرف جنگ کی
چھائی ہوئی بدلیاں
ایک طرف خون کی
بجھتی ہوئی کہکشاں
ایک طرف خواب کی
سوکھی ہوئی کھیتیاں

دائرہ مرگ میں
رقص کناں آنکھ کی
زد سے افق دور ہے

بند آنکھوں سے

بوند بوند دل دریا خشک ہونے والا ہے
تیرے نام کے قطرے ریگ جاں پہ بکھرے ہیں
دن ڈھلے تو میں کھولوں نیم خواب دروازے
اجنبی صداؤں سے طاق طاق روشن ہو
تیز گرم سانسوں پر جانکنی کا عالم ہو
اک لکیر کے پیچھے بھاگنے لگوں میں بھی
اپنی بند آنکھوں سے جاگنے لگوں میں بھی

بے بسی کا اعتراف

جب درندے جنگلوں سے شہر کی جانب چلے تھے رات تھی
اور رات بھی کالی بہت تھی
جگنوؤں کی فوج ان کی راہبر تھی
ساری دنیا بے خبر تھی
سبز فصلوں سے انھیں بھی دشمنی تھی
سبز فصلوں کی نگہبانی پہ لیکن کوئی آمادہ نہیں تھا
ہم، نہتے تھے، اکیلے تھے
ہمارے پاس بس آنکھیں تھیں
اور آنکھیں خلاؤں میں لکیریں کھینچنے کے شغل میں
مصروف تھیں

تم پاس رہو

سبزے کا سفر ختم ہوا
سامنے میرے
اب ریت ہے
اور ریت سے کچھ آگے چٹانیں
اور ان سے اُدھر کیا ہے
مری آنکھ نہ کھل جائے
تم پاس رہو
ہاتھ مرے ہاتھ میں دے دو
ہونٹوں پہ مرے برف کی تہ جمنے لگی ہے
بے جسم کے کچھ سائے نظر آنے لگے ہیں
پلکوں پہ مری بوجھ بنے اوس کے قطرے
نیندوں کا فسوں ٹوٹنے والا ہے کہاں ہو
اپنے سے جدا ہونے کی ساعت ہے کہاں ہو
تم پاس رہو
ہاتھ مرے ہاتھ میں دے دو
سبزے کا سفر ختم نہ ہو
آنکھ نہ کھل جائے

بلاوا

آؤ ان الجھی ہوئی سانسوں میں
پھر سے سناٹے پرونے آؤ
یہ ندی بہتی چلی جاتی ہے
تیری پرچھائیں ڈھلی جاتی ہے
روکنے والا کوئی ہاتھ نہیں
آدھا ٹوٹا ہوا وہ چاند مرے ساتھ نہیں
سیٹیاں لے کے ہوا نکلی ہے
آج گھن گھور چراغاں ہوگا
کنڈیاں کھلنے لگی ہیں گھر کی
سارے پردوں کو گراتے جاؤ
بس یہیں آکے ٹھہر جانا ہے
اسی نقطے سے لکیروں کا جنم ہونا ہے
پھر مثلث سے کوئی دائرہ ٹکرائے گا

نیند کی کرچیں چبھیں گی، آنکھیں
ٹہنیاں بن کے زمینوں میں اتر جائیں گی
دور جنگل کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی
اک نئی سمت میں مڑ جائے گی
آنکھ تا حدِّ نظر پھیلی ہوئی رات کی دیوار
میں گڑ جائے گی
خوف کے قطروں سے جسموں کے پیالے بھر کے
اجنبی بستی کے لوگ آئیں گے

ایک دعا

اے ہوا

طائروں کی توتلی آواز کو

اپنے کاندے پر اٹھائی پھر رہی ہے تو کہاں

دیکھ چٹانیں زمیں کے گوشے گوشے سے

ابھرتی آرہی ہیں

اور کالے پتھروں کے جسم سے

ہونٹ، آنکھیں، ہاتھ پیدا ہو رہے ہیں

اے ہوا

اپنے نکیلے ناخنوں سے ساری چٹانیں کھرچ دے

طائروں کی توتلی آواز کو اپنے کاندھوں پر

اٹھائے پھر رہی ہے تو کہاں

لمحۂ نایاب

آئینوں کی منتشر کرچوں میں
ٹوٹے دائروں کی دھند میں
جب نکیلی چھاتیوں والی چٹانیں جھومتی ہیں
بازگشتیں کچھ خلا میں گونجتی ہیں
منجمد، بے حس رگوں میں سوئیاں سی رینگتی ہیں
تب درندے جنگلوں میں جاگتے ہیں
تب تعاقب میں وہ سب اک دوسرے کے بھاگتے ہیں
تب لہو کی چیخ سے دل کانپتا ہے
سخت پتھر سبز کائی سے رہائی مانگتا ہے

شب بیداری کی حمایت میں

اے ہم نفسو کچھ سوچو
آنکھیں کھولو اور دیکھو
یہ بنجر رات تمھارے
سب خوابوں کی دشمن ہے
تم اپنی شب بیداری
اس کے ہاتھوں مت بیچو

کرن دو کرن دھوپ

مگر آنکھ دیوار میں کوئی روزن کرے اور دیکھے
ادھر روئی کے ننھے گالوں کے پیچھے بھٹکتے ہوئے
برف کی بوریاں اپنے کاندھوں پہ لادے ہوئے، ننھے بچے
تھکے جارہے ہیں
کہ اب شام ہونے لگی ہے
کرن دو کرن دھوپ باقی ہے
پاگل ہوا
بند دروازے اور کھڑکیاں توڑتی پھر رہی ہے
صداؤں کے ٹوٹے ہوئے آئینے جوڑتی پھر رہی ہے
ادھر روئی کے ننھے گالوں کے پیچھے بھٹکتے ہوئے
برف کی بوریاں اپنے کاندھوں پہ لادے ہوئے، ننھے بچے
تھکے جارہے ہیں
اگر آنکھ دیوار میں کوئی روزن کرے اور دیکھے!

اے رات

یہ بستر تنہائی
جی میں ہے
لپیٹوں میں
اے رات، وجود اپنا
کہہ دے تو سمیٹوں میں
اُس آدھے بدن والی
پرچھائیں کو دکھلا دے
میں آگ میں جلتا ہوں
تو اوس میں نہلا دے

دشمن دنیا

میں ہواؤں کے بھنور میں
زندہ و سالم کھڑا ہوں
بے یقیں مخلوق مجھ کو کوستی ہے
مارنے کا مجھ کو حیلہ اور بہانہ ڈھونڈتی ہے
اور جب میں خودکشی کرنے کا کرتا ہوں ارادہ
بے یقیں مخلوق مجھ کو روکتی ہے

کہاں ہو تم

حروف تتلیوں کے رنگ بن گئے
خموشیوں کو طول دیں گے، فاصلے بڑھائیں گے
ہم ایک دوسرے سے اور دور ہوتے جائیں گے
کہاں ہو تم!
تمھاری ہر دعا قبول ہو گئی

اپنے سے دوری

میں جینے کے شغل میں کیوں مصروف رہا
میری حد کیا ہے
میں کیوں یہ بھول گیا
اک دو سانسیں باقی ہیں
میں مجرم ہوں
میرے نام کی تختی
میرے کتبے کو
پڑھنے والی آنکھیں
کس کی آنکھیں ہیں

رہائی کے بعد

رات، کالی رات تھی
ہم آسمانوں کے لہو کے رنگ میں ڈوبے نہ تھے
بے چٹانوں کے پہاڑوں تک پہنچنے کی ہوس کے جبر سے مجبور تھے
خواہشوں کے آئینے ٹوٹے نہ تھے
سبز پیڑوں سے ڈھکی پگڈنڈیوں پر ریشمی پرچھائیوں کے قافلے تھے
قافلوں میں ہم نہ تھے
ہم زمینوں پر، سمندر میں، جزیروں پر، کہیں بھی ہم نہ تھے
رات، کالی رات نے منہ بند بوروں میں ہمارے جسم کا
اک ایک ذرّہ بھر لیا تھا
قید ہم کو کر لیا تھا
رات، کالی رات سورج کی رقابت میں بہت بے حال تھی
رات، کالی رات شاید تھک گئی ہے
ہم، ہمارے جسم کا اک ایک ذرّہ بند بوروں سے رہائی پا چکا ہے
سبز پیڑوں سے ڈھکی پگڈنڈیوں پر ریشمی پرچھائیوں کے قافلے ہیں
قافلوں میں ہم بھی ہیں
رات، کالی رات سورج کی رقابت میں بہت بے حال ہے

رات جُدائی کی رات

کٹتی نہیں سرد رات
ڈھلتی نہیں زرد رات
رات جُدائی کی رات
خالی گلاسوں کی سمت
تکتی ہوئی آنکھ میں
قطرۂ شبنم نہیں
کون لہو میں بہے
میری رگوں میں چلے
تیز ہو سانسوں کا شور
جلنے لگے پور پور
آئے سمندر میں جوش
گر پڑے دیوارِ ہوش
سوکھی ہوئی شاخ پر
برگ و ثمر کھل اٹھیں

آؤ مری نیند کی
بکھری ہوئی پتیاں
آج سمیٹو ذرا
کب سے کھلا ہے بدن
اس کو لپیٹو ذرا
ایک شکن دو شکن
بسترِ تنہائی پر
پھر سے بڑھا دو ذرا
مجھ کو رُلا دو ذرا
ایک پہر رات ہے
رات جُدائی کی رات

رَت جگوں کا زوال

وہ اندھیری رات کی چاپ تھی
جو گزر گئی
کبھی کھڑکیوں پہ نہ جھک سکی
کسی راستے میں نہ رک سکی
اسے جانے کس کی تلاش تھی

مری آنکھ اوس سے تر رہی ہے
مجھے خواب بُننے کی لت رہی
کبھی ایک سونی سی رہگذر پہ کھڑا تھا میں
کبھی دور ریل کی پٹریوں پہ پڑا تھا میں

وہ کسی کے جسم کی چاپ تھی
جو گزر گئی
اسے جانے کس کی تلاش تھی
مرے دل کے دشت کی ریت ہی میں کھلی تھی وہ

مجھے اک گلی میں ملی تھی وہ
اسے مجھ سے شوقِ وصال تھا
مرے خواب مجھ سے خفا ہوئے
مجھے نیند آئی میں سو گیا
یہی رت جگوں کا زوال تھا

آخری رات

سنو! آخری رات اترے گی آج آسماں سے
سنو! ان زمینوں پہ فصلیں اگانے کی سب کوششیں
رائیگاں ہو گئیں ہیں
پہاڑوں کو اپنی جگہ سے سرکتے ہوئے دیکھتے ہو
گھنے اور گہرے اندھیروں میں پرچھائیاں دفن کر کے
الاؤ جلانے کی تیاریوں میں کہاں منہمک ہو
درختوں سے گرتے ہوئے خشک پتوں کی آواز
بھوکے درندوں کو جنگل کی جانب بلانے لگی ہے
بدن کی سرنگوں میں بارود بھر لو
بدی کے دنوں کی ہر ایک بات پھر یاد آنے لگی ہے

رات سمندر کے اس طرف

دھند اور دھواں کتنا
مہربان ہے ہم پر
پاؤں ہیں زمینوں میں
آسمان ہے سر پر
خواہشوں کی کڑیوں کو
آج جوڑ لیں ہم بھی
ان بدی درختوں سے
پھول توڑ لیں ہم بھی
نیند کشتیاں لے کر
خواب بادباں کھولیں
رات کے سمندر کے
اس طرف چلے جائیں

سفر کی شام

کہانیوں کی ڈور کس نے کاٹ دی
بجھے الاؤ، خشک زرد پتیوں کا قافلہ اداس ہے
سروں پہ آسمان
نیچے نرم سبز گھاس ہے
نیند کا غبار دور پاس ہے
ہوا کے سرد ہاتھ میں چراغ ہے
چراغ جس کی لو کے متصل دھواں
دھواں جو بیتی رات ہے
دھواں جو آتی رات ہے
دھواں جو آنکھ سے دلوں میں دور تک اتر گیا
دھواں جو روشنی کا زخم، نور کی اساس ہے
کہانیوں کی ڈور کس نے کاٹ دی
لگی جو آنکھ رات تھی
کھلی جو آنکھ رات تھی
بجھے الاؤ، خشک زرد پتیوں کا قافلہ اداس ہے
نیند کا غبار دور پاس ہے

صداؤں کا سفر

ناریل توڑو
سمندر کشتیوں کے منتظر ہیں
ساحلوں کی ریت بھر لو مٹھیوں میں
آنسوؤں کو جذب کرنے کا وسیلہ
ایک دن یہ ریت ہوگی
گنبدوں میں گونجنے والی صداؤں کے سفر کی
آخری منزل ہوا کے مقبرے ہیں
مقبرے جو بن چکے ہیں
ناریل توڑو پڑھو اشلوک
جینے کی صعوبت ختم کردو

کہانیوں سے واسطہ

زمین کا طواف کر کے لوٹتی ہوا
اسی درخت پر رکی تھی یاد ہے
یہی درخت جس کے آس پاس
خشک پتیوں کا ڈھیر ہے
سیاہ اور سرد رات میں جلائی جائیں گی یہ پتیاں
الاؤ کی غذا بنائی جائیں گی یہ پتیاں
ہماری بیتی زندگی میں کوئی حادثہ نہ تھا
ہمارے ساتھ ہم ہی ہم تھے کوئی دوسرا نہ تھا
اسی لیے کہانیوں سے ہم کو واسطہ نہ تھا
اسی لیے تمام عمر ہم کو جاگنا پڑا

باقی آدھی داستاں

آؤ بوڑھے برگدوں کے سائے میں
اپنے حقے اور الاؤ پھر جلائیں
باقی آدھی داستاں چھیڑیں گے ہم
وہ اکیلا جنگلوں، دریاؤں سے ہوتا ہوا
بارشوں میں آندھیوں سے، بھیگتا، لڑتا ہوا
اس جگہ پہنچا جہاں اک قلعہ تھا
جس میں کھڑکی تھی نہ دروازہ کوئی
ایک سو گز گہری دس گز چوڑی کھائی
قلعہ کے اطراف
ہر اک گز کے بعد
سنگ و آہن کے کریہہ الشکل بت
جن کی آنکھیں آدمیوں کی طرح سب دیکھتی تھیں
اتنے میں اک چیخ نے توڑا سکوتِ بے کراں
''اس طرف وہ ساتواں بت، ساتواں بت، ساتواں بت''

وہ اُدھر دوڑا تو اک اور چیخ نے اس سے کہا
''اس طرف وہ گیارہواں بت، گیارہواں بت،
گیارہواں بت''
وہ ذرا پلٹا تو ایک اور چیخ نے اس سے کہا
''اس طرف وہ بیسواں بت، بیسواں بت، بیسواں بت''
وہ ذرا سنبھلا تو ایک اور چیخ نے اس سے کہا
''اس طرف وہ تیسواں بت، تیسواں، تیسواں بت''
تھک گیا وہ رُک گیا وہ، سو گیا وہ
ایسے ہی بوڑھے تناور برگدوں کے سائے میں
ایک پیشانی تھی اس کی اور اتنے سارے بت

ہم پیچھے آتے ہیں

سڑکوں پر آوارہ گری ختم کرو
ان گلیوں میں گھر ہیں
گھر ہیں سب خالی
دستک دینے پر لیکن کھل جاتے ہیں
تم آگے جاؤ
ہم پیچھے آتے ہیں

مژدۂ انقلاب

ہوا ان کے جو قید ہیں بوتلوں کے بدن میں
وہ سب دیو ہیں
خوف اور نفرتوں کے
وہ سب دیو اک روز آزاد ہوں گے
وہ سب دیو جس روز آزاد ہوں گے
تو اس شہر کا ایک اک فرد خود سے پشیمان ہوگا
طلسمِ ہوس ٹوٹ جانے پہ حیران ہوگا
نگاہیں کبھی آسمانوں کی جانب اٹھیں گی
کبھی ہاتھ کوئی اشارہ کریں گے
کبھی ہونٹ کچھ بولنے کا ارادہ کریں گے
مگر کچھ نہ ہوگا
فقط جنگ ہوگی
ہر اک سمت سے بارشِ سنگ ہوگی

قحط کے آثار

پھر گھنے جنگل نئی پگڈنڈیوں سے بس رہے ہیں
زرد پتوں کے الاؤ پھر درندوں کو
سرنگوں کا پتہ بتلا رہے ہیں
قحط کے آثار بڑھتے جا رہے ہیں
بوڑھے برگد آنکھ کھولے سو رہے ہیں
ناف کے نیچے لہو سیلاب بڑھتا جا رہا ہے
ایک انگلی کی انگوٹھی دوسری انگلی میں پہنچی
تیز یاتی ذائقوں کی جستجو میں رال ٹپکاتی زبانیں
منھ سے باہر آ گئی ہیں
ہم خدا کے قہر سے گھبرا رہے ہیں
ہم بدی کے راستوں پر جا رہے ہیں

اس کے حصّے کی زمیں

وہ یہاں تک روشنی کے ساتھ تھا
اس کی مٹھی میں کئی سورج بہت سے چاند تھے
اس کے قدموں کی صدا سے راستے آباد تھے
اس کی آنکھوں میں ادھورے خواب تھے
اس کے ہونٹوں پر خدا کا نام تھا
منزلِ سود و زیاں آئی نہ تھی
دھوپ اس کے درمیاں آئی نہ تھی
اور اس کے بعد یہ دیکھا گیا
پہلے وہ، پھر روشنی اوجھل ہوئی
اس کے حصّے کی زمیں جل تھل ہوئی
وہ یہیں تک روشنی کے ساتھ تھا

تنہائی

اندھیری رات کی اس رہگذر پر
ہمارے ساتھ کوئی اور بھی تھا
افق کی سمت وہ بھی تک رہا تھا
اسے بھی کچھ دکھائی دے رہا تھا
اسے بھی کچھ سنائی دے رہا تھا
مگر یہ رات ڈھلنے پر ہوا کیا
ہمارے ساتھ اب کوئی نہیں ہے

اپنے سے پہلا مکالمہ

ہوا کی کروٹوں نے آسمان پر
لکیریں پھر بنائی ہیں
انھیں گنو
کہ تم بہت اداس ہو
اداس کس لیے ہو تم
یہ بات تم میں کوئی جانتا نہیں
تمھارے کان اپنے دل کی بازگشت بھی کبھی نہ سن سکیں گے

تمھارے جسم بے لہو ہیں
ریت ان میں دوڑتی ہے
ریت بے سراب ہے
تمھاری قسمتوں میں بس عذاب ہے
اسی لیے تمھارے ہاتھوں نے زمین کو کبھی چھوا نہیں
ہوا کی کروٹوں نے آسمان پر
لکیریں پھر بنائی ہیں، انھیں گنو

اپنے سے دوسرا مکالمہ

سفر کی صعوبت سے بے حال ہو تم
شکستوں کے کس جشن کی یاد آئی
کھلی آنکھ سے دھند کو دیکھنے
ریت سے مٹھیاں بھرتے رہنے کا یہ سلسلہ
ختم ہو جائے گا، ایسا لگتا ہے، لیکن نہیں وہم ہے یہ تمھارا
زمیں رینگنے کے لیے ہی بنائی گئی ہے
مجھے اور تمھیں اس سے انکار کیوں ہو
تو پھر آؤ کچھ دیر کو بند آنکھیں کریں
اور کوئی خواب دیکھیں
سرابوں کے اطراف کی اِن زمینوں پہ پھر سبز کائی کو دیکھیں

اتنی روشنی

نہ جانے کیا ہوا دیوار و در کو
میں کن آنکھوں سے دیکھوں اپنے گھر کو
کہیں بھی دھند تاریکی نہیں ہے
ہر اک کمرے میں اتنی روشنی ہے
کہ کچھ بھی دیکھنا ممکن نہیں ہے

خوابوں سے دستبردار ہونے والوں کے نام

ساکت دریا دھیرے دھیرے جب حرکت میں آیا
کاغذ کی کشتی میں بیٹھے لوگ خوشی سے چیخ پڑے
ریت بھرے، ساحل سے ہلتے ہاتھوں نے
رومالوں میں اپنے اپنے خواب بھرے
اور اجڑے شہروں کی جانب لوٹ گئے

کچھ بولنے دو

کھولنے دو
خوشبو کے دریچے کھولنے دو
تولنے دو
اس طائر جاں کو دور دیس کے لمبے سفر پر جانے کو
پر تولنے دو
بولنے دو
اس جسم کی قید میں سرخ لہو کو بولنے دو
ان سبز سنہرے پردوں کے اس سمت بڑا سناٹا ہے
مت ٹوکو مجھے، مت روکو مجھے
کچھ بولنے دو

ایک ادھوری خواہش

یہ خنجر لو اور وار کرو
اور میرے سو ٹکڑے کر دو
پھر چھلنی جسم کو سہلاؤ
آنکھوں کی اوس میں نہلاؤ
تم میرے قاتل کہلاؤ
اس دن کے لیے میں زندہ ہو

ایک کالی نظم

میں کورے کاغذ پر لکھوں پھر ایک کالی نظم
الکھ جگاتے سناٹوں سے پھر سے سجاؤں بزم
گدر امرودوں کی خوشبو پاگل کر جائے
میری ان خالی آنکھوں کو جل تھل کر جائے
دور درندوں کی آوازیں خود سے لڑتی ہوں
میرے اس کے بیچ میں لمبی راتیں پڑتی ہوں

شکنوں سے عاری اک بستر مجھ کو تکتا ہو
جسم مرا جب آدھا سوتا آدھا جگتا ہو
تب میں کروں یہ عزم
کہ لکھوں کوئی کالی نظم

دیکھتے ہم بھی

کھجوروں کے درختوں سے
اترتے دیکھتے ہم بھی
انھیں، جن سے منور ہوگی یہ دنیا
مگر ہم دور تپتی ریت کے صحرا میں
ہوا کے اُن سنے گیتوں کو سننے کے لیے بیتاب تھے اتنے
کہ ہم نے یہ نہیں دیکھا
کھجوروں کے درختوں سے
کہاں، کب، کون اترا، کس طرح اترا

اُداسی کی ہجو

سمندروں سے خراج لے کر
مہیب صحراؤں سے گزر کر
حسین ابن علی کا لشکر
وہ آرہا ہے، وہ آ چکا ہے
تمام اشجار جھومتے ہیں
فرشتے سجدوں میں منہمک ہیں
چراغ ہر سمت جل رہے ہیں
بتاؤ اب تم اداس کیوں ہو
بتاؤ افتاد کیا پڑی ہے
تمھارے بازو پہ آج بھی کیوں
سیاہ پٹی بندھی ہوئی ہے

سوگندھی

(منٹو کے نام)

بدی بھری یہ بوریاں
نہ جانے کون موڑ تک
ہمارے ساتھ جائیں گی
سفید چادروں میں کس نے رات کو چھپالیا
ہماری ذلتوں سے کس نے اپنے عضو عضو کو سجالیا
کہ آج ناف کے قریب خواہشوں کی بھیڑ ہے
ادھر وہ گنبدوں کی گونج
جنگلوں کو جانے والے راستے
پلٹ پڑے
تری گلی میں ہر طرف سے آرہے ہیں بھیڑیے

کواڑ کھول، دیکھ کیسا جشن ہے
ہوا ابھرا وہ چاند
سات انچ نیچے آ گیا
غذا ملے گی چیونٹیوں کو تیرا کام ہو گیا
ہمارے ناخنوں کے میل سے
تیرے بدن کے گھاؤ بھر گئے
یہ حادثہ بھی ہو گیا
مگر کہاں سے بیچ میں یہ آسمان آ گیا

خود کلامی کی ایک اور کوشش

ابھی درختوں سے دھوپ اترے گی
راستوں پر
اداس پرچھائیوں کے لشکر
عجیب بے نام سے سفر پر
نکل پڑیں گے

سیاہ دھبوں کے دائروں میں
سفید نقطے، بنا بنا کر مٹانے والی تمھاری آنکھیں
یہ دیکھنے کو کھلی ہوئی ہیں
تم اپنی تنہائیوں کے صحرا کو ذرہ ذرہ سمیٹے جاؤ، بکھیرے جاؤ
زمین تھوڑی سی جو ملی ہے
اسی میں فصلیں اگائے جاؤ
مگر یہ سب کچھ تو وہ نہیں ہے جو ہم نے تم نے
خدا سے مانگا تھا
آس آنکھوں میں اب نہیں ہے
فلک کا سایہ نہیں ہے جس پر
یہ وہ زمیں ہے
ابھی درختوں سے دھوپ اتری تھی، یاد آیا

التباس

کالی بے رحم رات ختم ہوئی
کتنا اچھا ہوا کہ آنکھوں کو
اوس کے بوجھ سے نجات ملی
دھوپ دہلیز پر کھڑے ہو کر
سنسنی خیز تازہ خبروں پر
تبصرہ اس طرح کریں جیسے
چاہتے تھے اسی لیے سحر ہم لوگ
ہے یہی زندہ رہنے کا مقصد

ہم ہیں تیار پھر

بے نشاں منزلوں کی طرف بڑھ گئے
وہ، جو ہم کو، ہمیں سونپنے آئے تھے
آنسوؤں کی نمی اور لہو کی کمی
نور کی تیرگی، دھند کی روشنی
ہم میں حائل رہی
ان کو پہچاننے میں بڑی دیر کی
اس خطا کے لیے
ہم ہیں تیار پھر اک سزا کے لیے

الاؤ سرد ہو گیا

الاؤ سرد ہو گیا
ہماری روح کا الاؤ سرد ہو گیا
دبیز برف کی تہیں اٹھا کے دیکھ لو اگر یقیں نہ ہو
رگوں میں خون جم چکا
دل کی دھڑکنوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ جائے گا
ریت سے بنا ہوا یہ جسم ریت بن کے
دور دور پھیل جائے گا
سوائے ریت اب تمھارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا

آبشاروں کی صدا

آبشاروں کی صدا چٹان کے
جسم کو سہلا رہی ہے دیر سے
دور سے آتی ہوئی قدموں کی چاپ
اور مدھم ہو گئی
آسمانوں کی طرف جاتی ہوئی
تیز طوفانی ہوا مڑنے لگی
نیند کی ٹوٹی ہوئی زنجیر پھر جڑنے لگی
رنگ کے تودوں کے بننے اور بگڑنے کا سماں
دیکھنے کے واسطے سوئیں گے ہم
آنکھ کھلنے پر بہت روئیں گے ہم

میں شکر گذار ہوں

- سید وقار حسین کا، جنھوں نے اس مجموعے کو محبت بھری تنقیدی نظر سے دیکھا
- فرحان مجیب کا، جنھوں نے اس مجموعہ کے گرد پوش کا ڈیزائن بنایا
- جوگندر چاولہ کا جنھوں نے اس مجموعے کے لیے میرا فوٹو کھینچا
- شمیم حنفی اور قاضی افضال حسین کا جنھوں نے مجموعے کا نام تجویز کیا
- ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کا جو اس مجموعے کے کاتب سراج صاحب اور میرے درمیان موثر ذریعہ بنے
- ڈاکٹر عقیل احمد کا جنھوں نے اس مجموعے کو دیکھنے میں میری مدد کی
- مہتاب حیدر نقوی، ابوالکلام قاسمی، آشفتہ چنگیزی، انوار احمد خاں، عبید صدیقی، اور عزیزی وسیم الرحمن کا جو وقتاً فوقتاً اس مجموعے کی اور میری خیریت دریافت کرتے رہے
- انجم نعیم کا جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت کے لیے مجھے بار بار اکسایا
- اسعد یار خاں کا جنھوں نے اس مجموعے کی تقسیم کی ذمہ داری قبول کی

اور

- اپنی بیوی نجمہ شہریار کا جو اس مجموعے میں شامل اکثر چیزوں کی پہلی سامع ہیں

شہریار

نیند کی کرچیں

(۱۹۹۵)

وجے کمار بجاج

اور

فریدوں شہریار

کے

نام

پیش لفظ

جدید شاعری نے شاعری یا فن پارے کے خود مکتفی اور خود مختار ہونے کا دعویٰ کیا، اس معنی میں کہ فن پارہ بنانے والی وہ چیزیں ہیں جو اس کے اندر ہیں۔ کوئی خارجی حوالہ، چاہے وہ نظریے کا ہو یا سیاسی عقیدے کا، کسی تحریر کو فن پارہ نہیں بنا سکتا۔ آزادی کے اس اعلان کو ترقی پسندوں نے ''سماجی شعور کے فقدان'' اور ''سماجی معنویت سے انکار'' کا نام دے کر رد کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت محض اتنی ہے کہ ہم میں سے اکثر کی وابستگی ادب کے ساتھ سچی اور گہری نہیں ہے، اس لیے ان لوگوں کو ایسی شاعری ہمیشہ پریشان کن معلوم ہوگی جو خارج کو داخل کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کرتی ہے اور جو اس بات کی فکر نہیں کرتی کہ میرے کلام میں سماجی آگہی کا ظہور کتنا ہے اور کیا اس کے غیاب کو اس کے ظہور کا نام دے سکتے ہیں؟ جو اس بات کی فکر کرتی ہے کہ میرا کلام سچا اور ذاتی اظہار ہے یا اس پر کسی فارمولے کی رو سے تنقید ہو سکتی ہے؟ ایسی شاعری اپنے داخلی سرچشموں کو اپنے سچ کا معیار اور محک مانتی ہے۔ جن لوگوں کے لیے شاعری کی حقیقت سکۂ رائج الوقت کی سی ہے، ان کے لیے شہریار کی مندرجہ نظم ناقابل قبول ہوگی۔

میں نہیں جاگتا تم جاگو
سیہ رات کی زلف اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی
بارہا کر چکا کوشش میں تو

تم بھی اپنی سی کرو
اس تگ و دو کے لیے خواب مرے حاضر ہیں
نیند ان خوابوں کے دروازوں سے لوٹ جاتی ہے
سنو، جاگنے کے لیے ان کا ہونا
سہل کر دے گا بہت کچھ تم پر
آسماں ریگ میں کاغذ کی ناؤ
رک گئی ہے اسے حرکت میں لاؤ
اور کیا کرنا ہے تم جانتے ہو

میں نہیں جاگتا تم جاگو
سیہ رات کی زلف
اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی

(میں نہیں جاگتا)

یہ نظم اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا کی سچائیاں فریب ہیں۔ ہم لوگ سچائی کو حاصل کرنے کے لیے جو خواب دیکھتے ہے وہ سچے ثابت نہیں ہوتے، حتیٰ کہ ہم خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیتے ہیں، اور ہم میں سے جو لوگ ان خوابوں کو حقیقت بنانے کی تگ و دو کرتے بھی ہیں تو ان کی مثال ایسے لوگوں کی ہے جو ریگستان میں کاغذ کی ناؤ چلانا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں انسان اور اس کی دنیا کی جو صورت ہمیں دکھائی گئی ہے، ممکن ہے ہمیں اس سے اتفاق نہ ہو۔ لیکن نظم کا متکلم اسے ہمارے سامنے اپنے تجربے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ہم اس سے یہ سوال نہیں پوچھتے کہ تم نے کتنے تجربوں، کتنے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے؟ انسانی فکر و عمل کا بانجھ پن ایک تجربہ یا تصور ہے۔ یہ تجربہ اس نظم کے متکلم / شاعر نے داخلی یا خارجی سطح پر کیا ہے۔ نظم کی قوت اس بات میں نہیں ہے کہ یہ تجربہ

آج کے انسان نے بھی مختلف صورت حالات اور مختلف داخلی منظر ناموں کے حوالے سے حاصل کیا ہے۔ (ممکن ہے یہ نظم دنیا کی سچائیوں کے بارے میں ہو بھی نہیں، بلکہ کسی ذاتی نارسائی کے بارے میں ہو، اور یہ رات کی الجھی ہوئی زلف دنیا کی سچائیوں کے ناکام ہونے کا استعارہ نہ ہو، بلکہ کسی ذاتی سچائی کے ناکام یا بے اثر ہونے کا استعارہ ہو۔) نظم کی قوت ان باتوں میں نہیں ہے، بلکہ حسب ذیل دو باتوں میں ہے۔ (۱) متکلم کا ڈرامائی لہجہ، اس میں ایک ہلکے سے طنز کی لہر، دو شخصیتوں کی موجودگی، ایک متکلم اور ایک مخاطب (مخاطب قاری خود ہوسکتا ہے)۔ (۲) پوری نظم میں حرکت اور جنبش کا احساس ہے، لیکن اس کے لہجے میں تھکن اور اختتامیت ہے۔ ''میں نہیں جاگتا تم جاگو'' میں بیزاری اور مایوسی ہے جس پر طنز کی ہلکی سی تہ چڑھی ہوئی ہے۔ دنیا والوں نے طرح طرح کے نظام فکر ایجاد کیے، جنھیں میزانی (totalising) کہا جاسکتا ہے، یعنی ایسے نظام فکر جو انسان کے تمام دکھ درد کا علاج کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو انسانی فکر و عمل کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونے کی قوت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ تمام میزانی افکار یا نظام افکار جلد یا بدیر اپنے داخلی تضادات کا شکار ہو جاتے ہیں اور انسانی وجود کی ناؤ ویسی ہی کی ویسی بے حس و حرکت رہتی ہے۔

شہریار کی شاعری ایسے شخص کی شاعری ہے جس کا بہت کچھ، یا شاید سب کچھ، کھو چکا ہے یا چھن گیا ہے۔ وہ اس صورت حال پر رائے زنی کرسکتا ہے، لیکن اس صورت حال کو بدلنے پر وہ قادر نہیں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ تجربے کی شدت نے عمل کی قوت چھین لی ہے۔ اس میں کسی قسم کا اخلاقی یا سیاسی ڈائیلما نہیں، بس ایک منزل ہے، ایک وقت ہے، جو ٹھہر گیا ہے۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں، یا شاید سب لوگ ایسے ہیں جن کے لیے وقت ٹھہرتا نہیں، تجربہ جن کے لیے ایک گزرتے ہوئے فلم کے پردے کی طرح ہے۔ کبھی کبھی وہ پردے پر ہونے والے واقعات میں ذہنی طور پر اس طرح شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ واقعات انھیں اصلی اور خود اپنے پر گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر انھیں اس قدر بے قابو کر دیتے ہیں کہ وہ خود ان کے ساتھ دوڑنے لگتے ہیں

اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو وہ اپنا شریک یا حریف سمجھنے لگتے ہیں۔ شہریار کی نظموں غزلوں میں متکلم جمود کے صحرا میں اکیلا ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے بعض اور حقائق بھی بیان کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ایسا بھی ہے کہ متکلم کو اپنی صورت حال کا پورا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی تنہائی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہے:

میں پھنس گیا ہوں کہیں ریت کے بھنور میں کیا
تری مدد کا جو محتاج آج اتنا ہوں
یہ راستہ بھی گھنے جنگلوں سے گزرے گا
میں اس سفر میں اسی واسطے اکیلا ہوں
ہر ایک رنگ میں دیکھا ہے میں نے راتوں کو
میں خواب خوف سبب بے شمار جاگا ہوں

ان اشعار میں شکوہ شکایت نہیں، رنج بھی نہیں۔ ان میں خود آگہی اور ماحول کی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش ہے۔ ان کا لہجہ ایسے شخص کا لہجہ ہے جس نے دکھ درد سنانے، لوگوں کو متوجہ کرنے، اور خود کو دلچسپی کا محور بنانا سیکھا ہی نہیں۔ ان اشعار میں ڈرامائی کیفیت ہوتی تو میراجی کی ''جاتری'' کا سا رنگ پیدا ہو جاتا، کیوں کہ ان میں جتنا انکشاف ذات ہے اتنا ہی گرد و پیش کی دنیا پر تبصرہ بھی ہے۔ لیکن میراجی کا مسافر تلاش حقیقت اور دنیا کو سمجھنے کی کوشش سے مایوس نہیں ہوا۔ اس کے یہاں سعی و جہد کی ذہنی سطح (عملی سطح نہیں) متحرک اور فعال ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں اختتام کا احساس ہے، کہ اس کے آگے کچھ نہیں۔

اختتام کا احساس، اور یہ احساس کہ اگر اچھی چیزیں ختم ہو جاتی ہیں تو شاید بری چیزیں بھی ختم ہو جاتی ہیں، شہریار کی تازہ شاعری کا مرکزی تامل و تصور ہے۔ لیکن بری چیزوں کے ختم ہونے کا احساس کسی اطمینان کی سانس، کسی جھوٹی امید کی مصنوعی کرن، کسی مخالف و معاند آندھی کے ختم ہونے کا اعلان نہیں ہے۔ شہریار کا متکلم جہاں کھڑا ہے وہاں یہ سب چیزیں بھی ختم ہو چکی ہیں۔

ڈوبتی شام کے اس پار
کھڑے تھے جو لوگ
ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے
کہ ان لوگوں کی مٹھیاں بند تھیں
یہ ریت کہاں سے آئی؟

(حیران کرنے والی ایک بات)

(اب تک میں نے تین اقتباسات پیش کیے ہیں۔ تینوں میں ریت کا استعارہ آیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ یہ میرا غیر شعوری انتخاب تو نہیں؟ ممکن ہے پڑھنے والا اپنی آنکھ سے پڑھتا ہو، لیکن متن کی integrity اور سالمیت کچھ تو ہوتی ہوگی؟ ورنہ اس کلام میں بار بار ریت پر اصرار کیوں؟ یہ کچھ تو معنی رکھتا ہوگا؟)

آگ جسم برف کیسے ہو گیا؟
سوچتا ہوں میں
اور سوچ کر، اپنے آپ کے، اس زوال پر
کچھ اداس سا ہو رہا ہوں میں
آسمان پر، رات کے سوا، کچھ نہیں رہا
آخری دعا مانگنے کو ہوں (آخری دعا مانگنے کو ہوں)

جب آسمان پر رات کے سوا کچھ نہیں تو دعا بھی کیا مانگی جا سکتی ہے؟ یہ اختتام کی وہ منزل ہے جہاں امیدوں کا ملجا اور ماوا بھی اجڑے گھر کی طرح ہو جاتا ہے۔

کہیں بھی زیست کے آثار دکھلائی نہیں دیتے
یہی صورت رہی جو چند دن گھبرائیں گے ہم بھی
عجب وحشت تھی گھر کے سارے دروازے کھلے رکھے
ہمیں معلوم تھا اک روز دھوکا کھائیں گے ہم بھی

ایسی نظمیں بھی، جن میں بظاہر کامیابی ہے، ہمیں فوراً احساس دلاتی ہیں کہ یہ کامیابی دراصل طنز ہے خود اپنے اوپر بھی اور اس پر بھی جس نے متکلم کو اس کامیابی سے، ہم کنار کیا تھا۔ لہٰذا یہ کامیابی عجب غیر اطمینان بخش، ادھوری اور بالآخر ناکامی ہی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے ایسے تجربے کو کوئی بھی شاعر نظم کرتا تو بڑی دھوم دھام کا انتظام کرتا، ہمیں طرح طرح سے احساس دلاتا دیکھو بیسویں صدی کے اواخر میں زندگی یوں جیتے ہیں اور خود آگہی کو یوں بیان کرتے ہیں۔ شہریار کی شاعری کا سب سے بڑا کمال اس کا understatement (کم بیانی یا سبک بیانی) ہے، کہ وہ اپنے کلام میں جذبات کا زور کم ڈالتے ہیں اور اس کی رگ و پے میں بجلیاں پیس کر ڈالنے سے محترز رہتے ہیں۔ شروع میں بھی شہریار کو غیر ضروری الفاظ سے پرہیز اور کسی بات کو کہنے کے لیے کم سے کم توجہ انگیزی اختیار کرنے کی عادت تھی۔ یہ ان کی پختگی اور شاعرانہ عظمت کے مزید عروج کی علامت ہے کہ اب وہ اپنی بات کو ذاتی حوالے سے کہتے ہیں تو بھی جذبات کے جھالر گوٹے کے بغیر کہتے ہیں۔ ان کی بات اتنے فطری انداز میں، اتنے نامیاتی رنگ سے، ادا ہوتی ہے کہ اعلیٰ درجے کے ستار پر کسی راگ کے بے تکلف ادا ہو جانے کا تاثر پیدا ہوتا ہے:

میرا تو ارداہ تھا
ہونٹ سیڑھیوں سے میں
آسمان تک جاؤں
تو نے اس جگہ مجھ کو
اتنی دیر تک روکا
یہ بھی بھول بیٹھا میں
میرا کیا ارادہ تھا
اس وجود خاکی میں
جسم کچھ زیادہ تھا

(میرا تو ارادہ تھا)

یہ نظم ''ایک اور پیشن گوئی'' کی طرح کا نگینہ ہے، لیکن اس کا متکلم اب کچھ زیادہ تجربہ آشنا اور سرد و گرم چشیدہ ہے۔ اس کے لہجے میں ''ایک اور پیشن گوئی'' جیسا المیاتی شدید حزن نہیں، بلکہ ہر چیز کے ادھورے، ناکام اور بے اثر ہونے کے احساس، خود اور مخاطب پر طنز، اور ہر طرح کے جرم سے اپنی برات کا اعلان ہے۔ وجودِ خاکی میں جسم زیادہ نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ مندرجہ ذیل نظم ''ایک اور پیشن گوئی'' کی براہ راست یاد دلاتی ہے:

زرد پتے نحیف شاخوں پر
رات کے آخری کنارے سے
آنے والی مہیب آندھی کا
دیکھ لو، انتظار کرتے ہیں
لوگ سب اس عجیب منظر کو
بے ضرر کیوں شمار کرتے ہیں

(رات کے آخری کنارے سے)

یہ منظر بالکل عجیب نہیں ہے، اور ہم جیسے لوگ جو موت زیست کے چکر کے عادی ہو چکے ہیں، ان کے لیے پت جھڑ کی آندھی اور شاخوں کی بے طاقتی بے ضرر ہیں، کیوں کہ ہم لوگ قدرت اور دنیا کے ہر پہلو کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا اور فطرت کا استحصال کرنا اپنا حق جانتے ہیں۔ لیکن متکلم کے لیے موت اختتامی حقیقت ہے۔ اس کی آندھی ایسی نہیں جس کے جھکڑوں کا لطف لیا جائے۔ اور اس سے بڑھ کر اس کے زرد پتوں کا انتظار ہے، کہ ہم وہ زرد پتے ہیں جنھیں اپنے انجام کا انتظار ہے کہ زندگی ان کے لیے اب بے معنی ہو چکی ہے۔ متکلم کی آنکھ ظاہر کا پردہ چیر کر باطن کو دیکھتی ہے۔ وہ موت کی آندھی کا انتظار کرتے ہوئے پتوں کے ناگزیر انجام کو روک نہیں سکتا، لیکن وہ ظاہر بیں لوگوں سے کہہ ضرور سکتا ہے کہ زندگی اور موت کے چکر کو ان کی نگاہ سے بھی دیکھو جو اس کے قدموں کے تلے آ کر کچل گئے ہیں:

اس بات پہ کس واسطے حیران ہیں آنکھیں
پت جھڑ ہی میں ہوتے ہیں جدا پتے شجر سے

نحیف شاخوں پر زرد پتوں کو دیکھنا اور یہ احساس نہ ہونا کہ وہ موت جیسی آندھی کے منتظر ہیں ایسے ہی لوگوں کا کام ہے جو حسین ابن علی کو تنہا موت کے منھ میں جانے دیتے ہیں:

گزرے تھے حسین ابن علی رات ادھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

نظم اور غزل پر یکساں قدرت شہریار کی نمایاں صفت ہے اور رہی ہے۔ جیسے جیسے شاعر کے پاس کہنے کو کم ہوتا جاتا ہے، نظم کہنا اس کے لیے مشکل ہوتا جاتا ہے۔ غزل میں تو مروج مضامین اور پہلے کی کہی ہوئی باتوں کو الٹ پھیر کر کام چلایا جا سکتا ہے (بڑی غزل اس طرح نہیں بنتی، لیکن کامیاب غزل ضرور بن سکتی ہے۔) مگر نظم میں کامیاب ٹھہرنا کیا، قدم ٹکانا بھی ناممکن ہے جب تک کوئی بات اپنے دل سے نکال کر کہنے کے لیے نہ ہو۔ حالیہ نظموں میں شہریار کے یہاں جسم کا احساس، اور کسی طرح مد مقابل کے جسم کا احساس واضح ہوتا نظر آتا ہے۔ جس بات کو وہ اب تک بمشکل ہی صاف صاف کہتے تھے، اب اس کی پرچھائیں بے تکلف بعض نظموں پر پڑ رہی ہے۔

۱۔ دریائے خوں رگوں میں
بے تاب ہو رہا تھا
میں ہو رہا تھا پاگل

۲۔ ... میرے ہونٹوں نے
جسم پر تیرے بہت دیر تلک
حرفِ ناگفتنی تحریر کیا

۳۔ میں حصارِ آرزو میں مطمئن تھا
تم نے یاد آ کے
بدن کے بند کھولے

آؤ میں تم پر ہوس اسرار کھولوں
لب ترازو میں تمھیں تا دیر تولوں
آخری سسکی تلک میں چپ رہوں اور کچھ نہ بولوں
بس اسی اک کام میں مشتاق ہوں میں

اس نظم میں رسائی، نارسائی، خیالی جسم اور حقیقی جسم، اپنی مضبوطی میں اپنی کمی کا شعور، کئی طرح کی پیچیدہ باتیں بیک وقت یوں حل ہوگئی ہیں کہ نظم اپنی طرح کا شاہکار بن گئی ہے لیکن بعض اوقات شاعر بالکل مختلف طرح کا شخص معلوم ہونے لگتا ہے، کہ معاصر دانشوری اور دانشوروں کے کھوکھلے پن کے تئیں اس کا جذبۂ تحقیر اس کو سفاک بنا دیتا ہے، اور وہ شاعر جو خیالی / اصلی محبوب کے سامنے جھجکتا ہوا نظر آتا ہے، اپنے ساتھیوں کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

انھیں زندہ رہنے کی تھی ہوس
جو دکھائی دیتے تھے ہم نفس
کبھی روشنی کے حصار میں
کبھی چیونٹیوں کی قطار میں

(ہندستانی دانشوروں کے نام)

یہ نظم ہمارے نام نہاد دانشوروں کے نام پیغام بھی ہے اور ان کے کردار پر کھلا تبصرہ بھی۔ شاعر کا احتساب کبھی اپنے اوپر تنقید میں بھی نظر آتا ہے اور اس طرح اس کی طبعی انصاف پسندی کا ثبوت ملتا ہے:

جنوں کے جتنے تقاضے ہیں بھولے جاتے ہیں
کہ ساتھ وقت کے اوہام بھی بدلے جاتے ہیں

غزل میں شہریار کی محزونی اور احساس زیاں ان کی نظم سے بھی ہلکے لہجے میں معرض بیان میں آئے ہیں۔ ان کا انداز اس قدر لطیف اور لہجہ اس قدر دھیما ہے (کبھی کبھی

طنز کی ہلکی تیزی کے باوجود) کہ اگر قاری بہت ہوشیار نہ ہو تو وہ کئی اشعار پر سے بے کھٹکے گزر جائے گا۔ شہریار استعارہ بہت کم استعمال کرتے ہیں، ان کا پورا شعر استعارے کا کام کرتا ہے:

کہ آن پہنچا ہے دریا ترے زوال کا وقت
جو ہم سے لوگ کنارے پہ ٹھہرے جاتے ہیں

زمیں نے ہم کو بہت دیر میں قبول کیا
جلی حروف میں یہ بات لکھے جاتے ہیں

سیاہ رات نے بے حال کر دیا مجھ کو
طویل کر نہیں پایا کسی کہانی کو

بجائے میرے کسی اور کا تقرر ہو
قبول جو کرے خوابوں کی پاسبانی کو

جینے کا حق ادا کوئی ہم سے نہیں ہوا
تاویل اس کی کیا کریں کیسے نہیں ہوا
دن ڈھلے اور شام کا دیدار ہو پھر
کام دن بھر اس لیے اتنا کیا

ان اشعار کی خوبصورتی اور ان کے معنی تک پہنچنے کے لیے تامل کی ضرورت ہے۔ ان اشعار کے کہنے والے نے اپنا زیادہ تر فن آستین میں چھپا رکھا ہے۔ صرف ایک بات پوری شدت سے ظاہر ہے کہ محمد علوی جیسے لوگوں کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بظاہر اتنی آسانی سے، کوشش اور زور کے بغیر، relaxed انداز میں شعر کہہ سکتا ہو۔ فرق یہ ہے کہ محمد علوی اکثر ایسی باتیں کرتے ہیں جو فوراً متوجہ کر لیتی ہیں۔ شہریار ان سے بھی الگ ہٹ کر ایسی باتیں کرتے ہیں جن میں بظاہر توجہ انگیزی نہیں ہوتی۔ شہریار جیسی شاعری کرنے کے لیے بھی اور پڑھنے کے لیے بھی، خاص مشق اور تفکر درکار ہے۔

یوں تو شہریار کے کلام میں شروع سے ہی مشاقی اور پختگی کے جوہر نمایاں تھے اوران کے یہاں بھرتی کے الفاظ، ڈھیلے مصرعے، شعری آہنگ کی کمی، وغیرہ عیوب کا پتہ بالکل نہ تھا، لیکن گذشتہ برسوں میں، اور خاص کر زیرِ نظر مجموعے کی شاعری میں بیان کے تئیں ان کا رویہ بحیثیت مجموعی کچھ مہم جو، کچھ زیادہ جرات منداور زیادہ بے تکلف نظر آتا ہے۔ کچھ تو مزاج کے باعث، اور کچھ یونیورسٹی میں پروفیسری کے باعث شہریار نے زبان اور ہیئت میں تجربے اور تبدیلی کے سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اب وہ بندشیں آہستہ آہستہ ٹوٹتی نظر آتی ہیں۔ بحروں اور مصرعوں کی ترتیب میں زیادہ تنوع اور غیر رسمیت کا دور دورہ ہے۔ دیسی اور بدیسی الفاظ کے مابین کسرۂ اضافت، بعض جگہ اضافت کا حذف، بعض جگہ غیر معمولی تراکیب، یہ وہ خوش گوار جرات مندانہ اقدامات ہیں جو شہریار کی شاعری میں اب جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ہونٹوں سے اوس بوندیں
پیہم گرا رہا تھا

۲۔ پھر تری تتلی نما صورت مجھے یاد آگئی

۳۔ ہونٹ ندی سیلاب کا مجھ پر دروازہ کھولے
ہم کو میسر ایسے بھی اک دو پل ہو جائیں

۴۔ آؤ میں تم پر ہوس اسرار کھولوں
لب ترازو میں تمھیں تا دیر کھولوں

۵۔ اس شام افق پیشانی پر
اک بوسہ اور چڑھائیں گے
اور رات شجر تک جائیں گے

۶۔ آسماں ریگ میں کاغذ کی ناؤ

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اور محاورے کے تئیں شہریار کا رویہ ابھی اور ڈھیٹ اور بے پروا ہونا چاہیے، تا کہ ان کی تخلیقی قوت پرسے بند پوری طرح اٹھ سکے۔

اب ان کے یہاں بحروں کا تنوع تو ہے، بلکہ بعض جگہ تو وہ عروض کے سخت قاعدوں کو تھوڑا نرم کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن آہنگ میں مزید تنوع لانے کے لیے انھیں زبان میں بھی تنوع لانا ہوگا۔ انھوں نے جان بوجھ کر فارسی تراکیب اور نسبتاً نامانوس الفاظ سے گریز کیا ہے، تو اس کا بدل مروج زبان میں تھوڑی بہت توڑ پھوڑ کی صورت میں انھیں حاصل کرنا چاہیے۔ مندرجہ ذیل اشعار، اور ان کی طرح کے اور اشعار، ایک مخصوص طرز کی معراج کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں:

کس واسطے یہ تیری توجہ کا ہے مرکز
اس شاخ کا ہر پھول تو صرصر کے لیے ہے

خوش فہمی ابھی تک تھی یہی کارِ جنوں میں
جو میں نہیں کر پایا کسی سے نہیں ہوگا

افرادِ قصہ جیسے ہیں ویسے دکھائی دیں
زائل تماشا گاہ میں بینائی تو نہ ہو

میرے جنوں کے لیے تیری گواہی بہت
چاک گریباں نہ کیوں میں نے سیا آج تک

بس ایک لمحے کی مہلت دے پیاسی آنکھوں کو
مرے بدن کی صراحی میں آگ بھر جائے

آخری شعر میں پیکر، استعارہ اور کنایہ، تینوں غیر معمولی ہیں۔ شہریار کو یہاں تک پہنچنے میں تیس برس سے اوپر لگے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کم شاعر ایسے ہیں جن کی تخلیقی قوت اتنے لمبے عرصے تک اتنی مستعدی سے آگے قدم بڑھاتی رہی ہے۔ دیکھیں اس کا افق کہاں جا کر ٹھہرتا ہے، اور ٹھہرتا بھی ہے کہ نہیں:

یہ آنکھ کسی دور کے منظر کے لیے ہے

شمس الرحمٰن فاروقی

غزلیں

شہرِ جنوں میں کل تلک جو بھی تھا سب بدل گیا
مرنے کی خو نہیں رہی جینے کا ڈھب بدل گیا

پل میں ہوا مٹا گئی سارے نقوش نور کے
دیکھا ذرا سی دیر میں منظرِ شب بدل گیا

میری پرانی عرض پر غور کیا نہ جائے گا
یوں ہے کہ اس کی بزم میں طرزِ طلب بدل گیا

ساعتِ خوب وصل کی آنی تھی آ نہیں سکی
وہ بھی تو وہ نہیں رہا میں بھی تو اب بدل گیا

دوری کی داستان میں یہ بھی کہیں پہ درج ہو
تشنہ لبی تو ہے وہی چشمۂ لب بدل گیا

میرے سوا ہر ایک سے دنیا یہ پوچھتی رہی
مجھ سا جو ایک شخص تھا پتھر میں کب بدل گیا

عکس کو قید کہ پرچھائیں کو زنجیر کریں
ساعتِ ہجر تجھے کیسے جہانگیر کریں

پاؤں کے نیچے کوئی شے ہے زمیں کی صورت
چند دن اور اسی وہم کی تشہیر کریں

شہرِ امید حقیقت میں نہیں بن سکتا
تو چلو اس کو تصور ہی میں تعمیر کریں

اب تو لے دے کے یہی کام ہے ان آنکھوں کا
جن کو دیکھا نہیں ان خوابوں کی تعبیر کریں

ہم میں جرأت کی کمی کل کی طرح آج بھی ہے
تشنگی کس کے لبوں پر تجھے تحریر کریں

عمر کا باقی سفر کرنا ہے اس شرط کے ساتھ
دھوپ دیکھیں تو اسے سایے سے تعبیر کریں

باعثِ وحشتِ جنوں کہتے ہیں سب کچھ اور ہے
وجہِ سکون تو سہی غم کا سبب کچھ اور ہے

ہم نے خود اپنی رات کو اتنا طویل کر لیا
ورنہ ہمارے دور میں جینے کا ڈھب کچھ اور ہے

پلکوں پہ روکتے رہو، کاری ہیں وار خواب کے
کافی تو ڈھل چکی ہے یہ تھوڑی سی شب کچھ اور ہے

پانی کی ایک بوند سے پیاس کی ابتدا کرو
چشمے پہ جب رسائی ہو کہنا طلب کچھ اور ہے

دید سے لمس تک ہمیں کیا کیا نہ تجربے ہوئے
دِکھنے میں اور کچھ تھا وہ چھونے پہ اب کچھ اور ہے

امید سے کم چشمِ خریدار میں آئے
ہم لوگ ذرا دیر سے بازار میں آئے

سچ خود سے بھی یہ لوگ نہیں بولنے والے
اے اہلِ جنوں تم یہاں بیکار میں آئے

یہ آگ ہوس کی ہے جھلس دے گی اسے بھی
سورج سے کہو سایۂ دیوار میں آئے

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تنہائی ہماری
کیا سوچ کے ہم وادیٔ انکار میں آئے

دل دھڑکنے سے خفا ہے اور آنکھیں نم نہیں
پیچھے مڑ کے دیکھنے کی یہ سزا کچھ کم نہیں

ہاں انھیں میں کل برستے پانیوں کے عکس تھے
ہاں یہی آنکھیں کہ جن میں قطرۂ شبنم نہیں

ہے بہت مسرور مخلوقِ خدا اس بات پر
آنے والے موسموں میں ہجر کے موسم نہیں

اک ہوس آباد کوچے کی طرف جاتا ہوں میں
کیا چراغِ یادِ جاناں تیری لو مدھم نہیں

ایک موڑ آئے گا جب ہمتیں بھنور بن جائیں گی
اس سے آگے اس سفر میں کوئی پیچ و خم نہیں

ہر خواب کے مکاں کو مسمار کر دیا ہے
بہتر دنوں کا آنا دشوار کر دیا ہے

وہ دشت ہو کہ بستی سایہ سکوت کا ہے
جادو اثر سخن کو بے کار کر دیا ہے

گرد و نواح دل میں خوف و ہراس اتنا
پہلے کبھی نہیں تھا اس بار کر دیا ہے

کل اور ساتھ سب کے اس پار ہم کھڑے تھے
اک پل میں ہم کو کس نے اس پار کر دیا ہے

پائے جنوں پہ کیسی افتاد آ پڑی ہے
اگلی مسافتوں سے انکار کر دیا ہے

ہماری آنکھ میں نقشہ یہ کس مکان کا ہے
یہاں کا سارا علاقہ تو آسمان کا ہے

ہمیں نکلنا پڑا رات کے جزیرے سے
خطر اگرچہ اس اک فیصلے میں جان کا ہے

خبر نہیں ہے کہ دریا میں کشتیِ جاں ہے
معاہدہ جو ہواؤں سے بادبان کا ہے

تمام شہر پہ خاموشیاں مسلّط ہیں
لبوں کو کھولو کہ یہ وقت امتحان کا ہے

کہا ہے اُس نے تو گزرے گا جسم سے ہو کر
یقین یوں ہے وہ پکا بہت زبان کا ہے

پہلے کب شام و سحر ذکر تھا یوں دنیا کا
چل گیا مجھ پہ بھی آخر کو فسوں دنیا کا

میری وحشت نے عجب عہد کیا ہے اب کے
ہو نہ برہم کسی صورت بھی سکوں دنیا کا

واسطہ میرا پڑا اس سے تو یہ بات کھُلی
خوف طاری ہے ہر اک شخص پہ کیوں دنیا کا

میں نے ہر روز نئے رنگ میں دیکھا اس کو
کیا لکھوں گر میں قصیدہ نہ لکھوں دنیا کا

ابتدا جو بھی ہو انجام ہے ہر ایک کا یہ
زندہ رہنے کی ہوس اور جنوں دنیا کا

تیری سانسیں مجھ تک آتے بادل ہو جائیں
میرے جسم کے سارے علاقے جل تھل ہو جائیں

ہونٹ ندی سیلاب کا مجھ پہ دروازہ کھولے
ہم کو میسر ایسے بھی اک دو پل ہو جائیں

دشمن دھند ہے کب سے میری آنکھوں کے درپے
ہجر کی لمبی کالی راتیں کاجل ہو جائیں

عمر کا لمبا حصہ کر کے دانائی کے نام
ہم بھی اب یہ سوچ رہے ہیں پاگل ہو جائیں

جاں پھر سے لرز اٹھی دل درد سے بھر آیا
اک ایسا نیا منظر آنکھوں کو نظر آیا

ہر گام پہ رستے میں تھیں دھوپ کی دیواریں
مجھ جیسا برہنہ سر ان سے بھی گزر آیا

دریا تری موجوں کی انگڑائیاں گنتا ہوں
پیاسا ہوں مقدر میں یہ ایک ہنر آیا

بیدار دریچوں پر دستک سی سنائی دی
جب جب کبھی بھولے سے میں لوٹ کے گھر آیا

پہلے تجھے دیکھا تھا پرچھائیں کی صورت میں
پھر جسم ترا میری رگ رگ میں اتر آیا

آنکھ ہوں، ہاتھ ہوں، لب ہوں تو دیکھ
میں تو سر تا پا طلب ہوں، تو دیکھ

صبح کب آئی، کہاں شام ہوئی
میں تو زندانیء شب ہوں تو دکھ

میری منزل تری پیشانی ہے
دیکھ میں چیز عجب ہوں تو دیکھ

تو نے دیکھا نہیں خود کو کب سے
میں ترے سامنے اب ہوں تو دیکھ

سیاہ رات نہیں لیتی نام ڈھلنے کا
یہی تو وقت ہے سورج ترے نکلنے کا

یہاں سے گزرے ہیں گزریں گے ہم سے اہلِ وفا
یہ راستہ نہیں پرچھائیوں کے چلنے کا

کہیں نہ سب کو سمندر بہا کے لے جائے
یہ کھیل ختم کرو کشتیاں بدلنے کا

بگڑ گیا جو یہ نقشہ ہوس کے ہاتھوں سے
تو پھر کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلنے کا

زمیں نے کر لیا کیا تیرگی سے سمجھوتا
خیال چھوڑ چکے کیا چراغ جلنے کا

بہتے دریاؤں میں پانی کی کمی دیکھنا ہے
عمر بھر مجھ کو یہی تشنہ لبی دیکھنا ہے

رنج دل کو ہے کہ جی بھر کے نہیں دیکھا تجھے
خوف اس کا تھا جو آئندہ کبھی دیکھنا ہے

شب کی تاریکی، درِ خواب ہمیشہ کو بند
چند دن بعد تو دنیا میں یہی دیکھنا ہے

خون کے قطروں نے طوفان اٹھا رکھا ہے
اب رگ و پے میں مجھے برف جمی دیکھنا ہے

کس طرح رینگنے لگتے ہیں یہ چلتے ہوئے لوگ
یارو کل دیکھو گے یا آج ابھی دیکھنا ہے

گزرے تھے حسین ابنِ علی رات ادھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

اس بات پہ کس واسطے حیران ہیں آنکھیں
پت جھڑ ہی میں ہوتے ہیں جدا پتے شجر سے

تو یوں ہی پشیماں ہے سبب تو نہیں اس کا
نیند آتی نہیں ہم کو کسی خواب کے ڈر سے

سنتے ہیں بہت نام کبھی دیکھتے ہم بھی
اے موجِ بلا تجھ کو گزرتے ہوئے سر سے

تھکنا ہے، ٹھہرنا ہے بہر حال سبھی کو
جی اپنا بھی بھر جائے گا اک روز سفر سے

خجل چراغوں سے اہلِ وفا کو ہونا ہے
کہ سرفراز یہاں پھر ہوا کو ہونا ہے

اب اس زمین سے انکھوا نہ کوئی پھوٹے گا
ذلیل و خوار جو کالی گھٹا کو ہونا ہے

پہاڑ ہیں کہ نمودار ہوتے جاتے ہیں
بلند اور بھی دستِ دُعا کو ہونا ہے

یہ ایک بات نہیں جانتے جو ہم چپ ہیں
کہاں سکوت میں شامل صدا کو ہونا ہے

ہمارا حال بھی اس معرکے میں ابتر ہے
اگرچہ پست تو موجِ بلا کو ہونا ہے

نہیں روک سکو گے جسم کی ان پروازوں کو
بڑی بھول ہوئی جو چھیڑ دیا کئی سازوں کو

کوئی نیا مکین نہیں آیا تو حیرت کیا
کبھی تم نے کھلا چھوڑا ہی نہیں دروازوں کو

کبھی پار بھی کر پائیں گی سکوت کے صحرا کو
در پیش ہے کتنا اور سفر آوازوں کو

مجھے کچھ لوگوں کی رسوائی منظور نہیں
نہیں عام کیا جو میں نے اپنے رازوں کو

کہیں ہو نہ گئی ہو زمین پرندوں سے خالی
کھلے آسمان پر دیکھتا ہوں پھر بازوں کو

میں چاہتا ہوں نہ آئیں عذاب آئیں گے
یہ جتنے لوگ ہیں زیرِ عتاب آئیں گے

اس اک خبر سے سراسیمہ ہیں سبھی کہ یہاں
نہ رات ہوگی نہ آنکھوں میں خواب آئیں گے

ذرا سی دیر ہے خوشبو و رنگ کا میلہ
خزاں کی زد میں ابھی یہ گلاب آئیں گے

ہر ایک موڑ پہ اک حشر سا بپا ہوگا
ہر ایک لمحہ نئے انقلاب آئیں گے

پلٹ کے آئے نہیں کیوں جنوں کی وادی سے
جنھیں یہ زعم تھا وہ کامیاب آئیں گے

منظرِ دیدہ و دل بدلا ہے
مدتوں بعد تجھے دیکھا ہے

تیرے چہرے کے خد و خال لیے
میں نے ہر شئے میں تجھے ڈھونڈا ہے

فاصلہ تیرے مرے بیچ میں ہے
جانے کیوں ایسا مجھے لگتا ہے

رائیگاں جائے نہ یہ ساعت بھی
وقت دریا ہے کبھی ٹھہرا ہے

سرحدِ شہرِ ہوس پر پھر دیکھ
ساری مخلوقِ خدا یکجا ہے

مہر ہونٹوں پہ لگی ہے سب کے
شرم سے سر کو جھکا رکھا ہے

دیکھنے والوں میں اک میں بھی ہوں
ان میں شامل نہیں یہ اچھا ہے

کارِ دنیا مجھے مہلت تھوڑی
کارِ دل، کارِ جنوں کرنا ہے

یہ تو طے ہے کہ سفر کرنا ہے
یہ نہیں طے ہے کدھر جانا ہے

لے دے کے تھی متاعِ جاں تو نے قبول کی نہیں
اس سے زیادہ کی بساط اہلِ جنوں کی تھی نہیں

گزرا تھا رات بھی کوئی دریا لبوں کے پاس سے
کتنی عجیب پیاس ہے کم تو ہوئی بجھی نہیں

میں نے کہا زمین کی وسعت کو آشکار کر
اس نے جواب میں کہا ٹھہرو ذرا ابھی نہیں

آنکھوں میں خون آ گیا چہرہ عدو کا دیکھ کر!
میری رگوں میں شکر ہے برف کی تہہ جمی نہیں

خوابوں کی تیغِ تیز سے کر لو شکار رات کو
یارو اذانِ صبح ہے اب جو نہیں کبھی نہیں

مجھے کوئی اُمید کبھی بھی نہیں تھی بادل سے
میں پیاسا ہوں مجھے پانی دے اس چھاگل سے

کوئی تیرے سوا نہیں جانتا ہے یاں قدر اس کی
میں عمر بدلنا چاہتا ہوں جس اک پل سے

مرے آج کی سرگرمی کا ہے یہ اک منشا
رہے کوئی نہ رشتہ باقی اب میرا کل سے

میں اتنا ہی اس میں اور بھی پھنستا جاتا ہوں
میں جتنا نکلنا چاہتا ہوں شب دلدل سے

ترے ہجر کی لمبی راتیں سب سے کہتی ہیں
کوئی عشق نہ آئندہ کرے کسی پاگل سے

وہ جو وہاں اک عکس ہے سہما ہوا ڈرا ہوا
دیکھا ہے اس نے غور سے سورج کو ڈوبتا ہوا

تکتا ہوں کتنی دیر سے دریا کو میں قریب سے
رشتہ ہر ایک ختم کیا پانی سے پیاس کا ہوا

ہونٹوں سے آگے کا سفر بہتر ہے ملتوی کریں
وہ بھی ہے کچھ نڈھال سا میں بھی ہوں کچھ تھکا ہوا

کل اک برہنہ شاخ سے پاگل ہوا لپٹ گئی
دیکھا تھا خود یہ سانحہ لگتا ہے جو سنا ہوا

پیروں کے نیچے سے مرے کب کی زمیں نکل گئی
جینا ہے اور یا نہیں اب تک نہ فیصلہ ہوا

خواہشیں جسم میں بو دیکھتا ہوں
آج میں رات کا ہو دیکھتا ہوں

سیڑھیاں جاتی ہوئی سورج تک
دیکھنا چاہا تھا سو دیکھتا ہوں

تتلیاں، پھول بھنور خوشبو کے
یاد وہ آتا ہے تو دیکھتا ہوں

اے خدا اور نہ دیکھے کوئی
میں کھلی آنکھ سے جو دیکھتا ہوں

شرط گر یہ ہے سمندر تیری
کشتیاں ساری ڈبو دیکھتا ہوں

آئینے دھندلے ہوئے ماضی کے
آنسوؤں سے انھیں دھو دیکھتا ہوں

فراقِ یار میں حالت عجب بنا لی ہے
بدن وہی ہے پہ چنگاریوں سے خالی ہے

رگوں میں خون کی مقدار اب بہت کم ہے
ہماری آنکھوں میں جو ہے شفق کی لالی ہے

یہی تو وقت ہے ظلمات سے گزرنے کا
گدا ہے چاند بھی خورشید بھی سوالی ہے

خلا کو تکنا شب و روز کا وظیفہ ہے
نگاہ جب سے ترے بام سے ہٹا لی ہے

غمِ جہاں میں غمِ جاں سے بے تعلق ہیں
بڑے جتن سے یہ راہِ مفر نکالی ہے

بے چین بہت روح جو پیکر کے لیے ہے
یہ آخری تحفہ کہ سمندر کے لیے ہے

کس واسطے یہ تیری توجہ کا ہے مرکز
اس شاخ کا ہر پھول تو صرصر کے لیے ہے

جو سامنے ہوتا ہے نہیں دید کے قابل
یہ آنکھ کسی دور کے منظر کے لیے ہے

آواز ذرا دیر سے للکار رہی ہے
تلوار جہاں بھی ہے ترے سر کے لیے ہے

تیز ہوا میں جلا دل کا دیا آج تک
زیست سے اک عہد تھا پورا کیا آج تک

میرے جنوں کے لیے تیری گواہی بہت
چاک گریباں نہ کیوں میں نے سیا آج تک

کتنے سمندر مجھے روز ملے راہ میں
بوند بھی پانی کہیں میں نے پیا آج تک

علم کے اس شہر میں کوئی نہیں پوچھتا
کارِ سخن کس طرح میں نے کیا آج تک

مہر و وفا کے سوا دوست نہیں جانتے
مجھ کو دیا ہے سدا کچھ نہ لیا آج تک

ہم اہلِ دل کی شہر میں رسوائی تو نہ ہو
اک بے وفا کی اتنی پذیرائی تو نہ ہو

افراد قصہ جیسے ہیں ویسے دکھائی دیں
زائل تماشا گاہ میں بینائی تو نہ ہو

ہر اک ادا پسند ہے معشوق کی ہمیں
ظالم ہو، بد دماغ ہو، ہرجائی تو نہ ہو

موجود ہوں رقیب یہ برداشت ہے ہمیں
بزمِ خیالِ یار میں تنہائی تو نہ ہو

ہم خواب دیکھتے ہیں مخالف نہیں ترے
اے رات یوں حریفِ شکیبائی تو نہ ہو

جہاں تک ہو گا جب تک ہو گا دل بہلائیں گے ہم بھی
کسی دن تو تجھے بھولے سے یاد آ جائیں گے ہم بھی

کریں گے ہم کہاں تک دور کی آواز کا پیچھا
ابھی اک موڑ ایسا آئے گا پچھتائیں گے ہم بھی

کہیں بھی زیست کے آثار دکھلائی نہیں دیتے
یہی صورت رہی جو چند دن گھبرائیں گے ہم بھی

عجب وحشت تھی گھر کے سارے دروازے کھلے رکھے
ہمیں معلوم تھا اک روز دھوکا کھائیں گے ہم بھی

اُس اک لمحے کے آنے تک غموں کو ملتوی رکھیں
وفائیں، کر کے اپنی یاد جب پچھتائیں گے ہم بھی

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تری روانی کو

سیاہ رات نے بے حال کر دیا مجھ کو
کہ طول دے نہیں پایا کسی کہانی کو

بجائے میرے کسی اور کا تقرر ہو
قبول جو کرے خوابوں کی پاسبانی کو

اماں کی جا مجھے اے شہر تو نے دی تو ہے
بھلا نہ پاؤں گا صحرا کی بیکرانی کو

جو چاہتا ہے کہ اقبال ہو سوا تیرا
تو سب میں بانٹ برابر سے شادمانی کو

جو چاہتی دنیا ہے وہ مجھ سے نہیں ہوگا
سمجھوتا کوئی خواب کے بدلے نہیں ہوگا

اب رات کی دیوار کو ڈھانا ہے ضروری
یہ کام مگر مجھ سے اکیلے نہیں ہوگا

خود فہمی ابھی تک تھی یہی کارِ جنوں میں
جو میں نہیں کر پایا کسی سے نہیں ہوگا

تدبیر نئی سوچ کوئی اے دلِ سادہ
مائل بہ کرم تجھ پہ وہ ایسے نہیں ہوگا

بے نام سے اک خوف سے دل کیوں ہے پریشاں
جب طے ہے کہ کچھ وقت سے پہلے نہیں ہوگا

ایک پل دو قدم کا ساتھ ہی کیا
اب کھلا سائے کی حیات ہی کیا

سیکڑوں خوابوں کی ضرب تقسیم
اس کا حاصل رہے گی رات ہی کیا

کچھ تمنائیں چند پچھتاوے
ہم سے لوگوں کی کائنات ہی کیا

پہلے کرتے ہیں مدح اوروں کی
پھر یہ کہتے ہیں تیری بات ہی کیا

دیکھا ان آنکھوں سے بہت کچھ ہے
ہم لکھیں دل کی واردات ہی کیا

ابھی تھا بیچ سمندر میں اب کنارے پہ ہے
یہ سارا کھیل یہ کرتب ترے اشارے پہ ہے

بدن میں کتنا لہو ہے یہ جانچ کر والو
بتانا پھر کہ جنوں کتنا کس سہارے پہ ہے

سیاہ رات کو خاطر میں لائے تو کیسے
جمی ہوئی یہ نگہ کب سے اک ستارے پہ ہے

ہوا کا اگلا قدم آسمان پر ہوگا
مرے وجود کا اثبات اس نظارے پہ ہے

میں اس طرف ہوں سراسیمہ اور بہت خاموش
مرا سفینہ اُدھر دوسرے کنارے پہ ہے

دیکھوں کہ ہے رشتہ کیا کتنا اُسے بھاتا ہوں
آندھی میں دیئے میں یوں ہر بار جلاتا ہوں

دریا تری طغیانی دہشت لیے آتی ہے
میں ہوں کہ تجھے پھر بھی ہر روز بلاتا ہوں

ان سرخ گلابوں تک یہ ہونٹ مرے پہونچیں
یہ کارِ جنوں دیکھو کب کر کے دکھاتا ہوں

جس نے مرے ہونے کی ہر وقت گواہی دی
اس شہر کی سرحد سے آگے نہیں جاتا ہوں

سرمایۂ جاں کیا ہے تیری ہی امانت ہے
تو دیکھ کبھی کہہ کے میں کیسے لٹاتا ہوں

جینے کا حق ادا کوئی ہم سے نہیں ہوا
تاویل اس کی کیا کریں کیسے نہیں ہوا

سنتے ہیں لوگ بابِ جنوں بند کر چکے
کہتے ہیں ایسا آج سے پہلے نہیں ہوا

آثار سے تو لگتا ہے ہم یہ خبر سنیں
سورج طلوع رات کے ڈر سے نہیں ہوا

وہ مہربان ہم پہ ہوا کل بھی خواب میں
جیسی ہمیں امید تھی ویسے نہیں ہوا

یاد آ نہ جائے پھر کسی عنوان سے ہمیں
افسوس کوئی جس سے بچھڑ کے نہیں ہوا

جنوں کے جتنے تقاضے ہیں بھولے جاتے ہیں
کہ ساتھ وقت کے لو ہم بھی بدلے جاتے ہیں

ضرور ہم سے ہوئی ہے کہیں پہ کوتاہی
تمام شہر میں سناٹے پھیلے جاتے ہیں

کہ آن پہونچا ہے دریا ترے زوال کا وقت
جو ہم سے لوگ کنارے پہ ٹھہرے جاتے ہیں

زمیں نے ہم کو بہت دیر میں قبول کیا
جلی حروف میں یہ بات لکھے جاتے ہیں

وہی کہ جس سے تعلق برائے نام ہے اب
اُسی کا راستہ دن رات دیکھے جاتے ہیں

عکسِ یادِ یار کو دھندلا کیا ہے
میں نے خود کو جان کر تنہا کیا ہے

بھول کر تجھ کو پشیماں ہوں بہت میں
لوگ کہتے ہیں بہت اچھا کیا ہے

دن ڈھلے اور شام کو دیدار ہو پھر
کام دن بھر اس لیے اتنا کیا ہے

جتنی شمعیں ہیں ہوا کو سونپ دوں گا
کون پوچھے گا کہ کیوں ایسا کیا ہے

شہر یہ آباد تھا شاید ہوں میں بھی
کس کی وحشت نے اسے صحرا کیا ہے

عیش دنیا سے خفا تھا شاد تھا میں
زندگی تو نے سگِ دنیا کیا ہے

ہجر کی لمبی رات کا خوف نکل جائے
آنکھوں پر پھر نیند کا جادو چل جائے

بڑی بھیانک ساعت آنے والی ہے
آؤ جتن کر دیکھیں شاید ٹل جائے

روشن تو کر دینا لو سرگوشی کی
جب میری آواز کا سایہ ڈھل جائے

میں پھر کاغذ کی کشتی پر آتا ہوں
دریا سے کہلا دو ذرا سنبھل جائے

یا میں سوچوں کچھ بھی نہ اس کے بارے میں
یا ایسا ہو دنیا اور بدل جائے

جتنی پیاس ہے اس سے زیادہ پانی ہو
ممکن ہے، اے کاش یہ خطرہ ٹل جائے

سنا یہی ہے پذیرائی ہنر ہوگی
شمار زخم پہ آمادہ وہ نظر ہوگی

نصیب عشق میں لکھی ہے وصل کی ساعت
یقین رکھو شبِ ہجر مختصر ہوگی

قصور اس میں سمندر کا تھا نہ پیاس کا تھا
ہماری آنکھ ہی مرکوز ریت پر ہوگی

دلِ عزیز بہت وسعتوں سے خوف نہ کھا
زمین اور سکڑ جائے گی تو گھر ہوگی

زعم اچھا نہیں اتنا یارو
پڑھو دیواروں پہ لکھا یارو

آگ کے کھیل میں جل جانا ہے
تجربہ ہے یہی اپنا یارو

روٹھ جائے تو نہیں منتی ہے
بڑی بے رحم ہے دنیا یارو

غم میں دبلے ہیں تمھارے جو لوگ
ان کے سائے سے بھی بچنا یارو

کتنی مشکل سے بسا ہے یہ شہر
کیا کبھی تم نے یہ سوچا یارو

مجھ پہ اور مجھ سے بہت لوگوں پہ
کتنا احسان ہے اس کا یارو

دل رجھا ہے تجھ پہ ایسا بدگماں ہوگا نہیں
تو نہیں آیا تو سمجھا تو یہاں ہوگا نہیں

جب بھی کوئی ڈوبتا ہے لوگ کہتے ہیں یہی
ناؤ کیسے ڈوبتی یوں بادباں ہوگا نہیں

سوچ تجھ کو حسن کی دولت ملی ہے کس لیے
دیکھ مجھ سے دور رہ کر بیکراں ہوگا نہیں

رات اپنے پَر نہ کھولے تو جھلس جائے زمیں
اس سے کیا مطلب ہے میرا یہ بیاں ہوگا نہیں

سب مجھی سے متفق ہیں اور ان کی رائے ہے
شہراب کے بھی جلے گا ہاں دھواں ہوگا نہیں

عہدِ گل کے سبھی آثار ہوا لے جاتی
زرد پتوں کو بہت دور اڑا لے جاتی

میری مٹھی نے رہا کر دیا صحراؤں کو
ورنہ آوازِ جرس ساتھ میں کیا لے جاتی

ساحلِ خواب پہ میں کب سے کھڑا ہوں تنہا
موجِ دریائے ہوس مجھ کو بہا لے جاتی

فصل زخموں کی پکی ہوتی نہ کاٹی جاتی
اشک آنکھوں کے اگر کالی گھٹا لے جاتی

ہم جدا ہو گئے آغازِ سفر سے پہلے
جانے کس سمت ہمیں راہِ وفا لے جاتی

بتاؤں کس طرح احباب کو آنکھیں جو ایسی ہیں
کہ کل پلکوں سے ٹوٹی نیند کی کرچیں سمیٹی ہیں

سفر میں نے سمندر کا کیا کاغذ کی کشتی میں
تماشائی نگاہیں اس لیے بیزار اتنی ہیں

خدا میرے عطا کر مجھ کو گویائی کہ کہہ پاؤں
زمیں پر رات دن جو باتیں ہوتی میں نے دیکھی ہیں

تو اپنے فیصلے سے وقت اب آگاہ کر مجھ کو
گھڑی کی سوئیاں کب سے اس اک نقطے پہ ٹھہری ہیں

جتن تیرا کہ پہونچایا ہے مجھ کو موت کے منھ تک
مری آنکھیں کہ اس کو زیست کا زینہ سمجھتی ہیں

یہ جگہ اہلِ جنوں اب نہیں رہنے والی
فرصتِ عشق میسر کہاں پہلے والی

کوئی دریا ہو کہیں جو مجھے سیراب کرے
ایک حسرت ہے جو پوری نہیں ہونے والی

وقت کوشش کرے، میں چاہوں، مگر یاد تری
دھندلی ہو سکتی ہے دل سے نہیں مٹنے والی

اب مرے خوابوں کی باری ہے یہی لگتا ہے
نیند تو چھن چکی کب کی مرے حصے والی

ان دنوں میں بھی ہوں کچھ کارِ جہاں میں مصروف
بات تجھ میں بھی نہیں رہ گئی پہلے والی

سفر کا نشہ چڑھا ہے تو کیوں اتر جائے
مزا تو جب ہے کوئی لوٹ کے نہ گھر جائے

بس ایک لمحے کی مہلت دے پیاسی آنکھوں کو
مرے بدن کی صراحی میں آگ بھر جائے

ہوس کی کشتی کی سب بادبان کھول دیے
کہ تو سکون سے دریا کے پار اتر جائے

اٹھا رہی ہیں بہت سر یہ رات کی چیخیں
مرے سکوت کی تلوار کام کر جائے

اس ایک نقطۂ روشن سے آگے کیا ہوگا
یہیں پہ قافلہ یہ زیست کا ٹھہر جائے

یہاں نہ رک کہ یہاں میں اجاڑ صحرا ہوں
بدن کی کشتی ادھر لا جہاں میں دریا ہوں

میں پھنس گیا ہوں کہیں ریت کے بھنور میں کیا
تری مدد کا جو محتاج آج اتنا ہوں

مجھے بتاتا ہے گرمی کی دوپہر کیا ہے
ببول سائے میں تا دیر میں بھی ٹھہرا ہوں

یہ راستہ بھی گھنے جنگلوں سے گزرے گا
میں اس سفر میں اسی واسطے اکیلا ہوں

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہے میں نے راتوں کو
کہ خواب خوف سبب بے شمار جاگا ہوں

جہاں میں ہونے کو اے دوست یوں تو سب ہوگا
ترے لبوں پہ مرے لب ہوں ایسا کب ہوگا

اسی امید پہ کب سے دھڑک رہا ہے دل
ترے حضور کسی روز یہ طلب ہوگا

مکاں تو ہوں گے مکینوں سے سب مگر خالی
یہاں بھی دیکھو تماشا یہ ایک شب ہوگا

کوئی نہیں ہے جو بتلائے میرے لوگوں کو
ہوا کے رُخ کے بدلنے سے کیا غضب ہوگا

نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے ایسا حاکمِ شہر
جو حادثہ نہیں پہلے ہوا وہ اب ہوگا

نکلا ہے چاند شب کی پذیرائی کے لیے
یہ عذر کم ہے انجمن آرائی کے لیے

تھا بولنا تو ہو گئے خاموش ہم سبھی
کیا کچھ کیا ہے شہرت و رسوائی کے لیے

پل بھر میں کیسے لوگ بدل جاتے ہیں یہاں
دیکھو کہ یہ مفید ہے بینائی کے لیے

سرسبز میری شاخِ ہنر کیوں نہیں ہوئی
یہ مسئلہ ہے تیرے تمنائی کے لیے

ہے آج یہ گلہ کہ اکیلا ہے شہریار
ترسوگے کل ہجوم میں تنہائی کے لیے

دھیان آتا کہ نہ آتا کسی ہرجائی کا
دل کہ دشمن ہے ہمیشہ سے شکیبائی کا

ساتھ الفاظ اگر دیتے تو میں بتلاتا
لطف جو مجھ کو ملا بزم میں تنہائی کا

سرفرازئ جہاں کیوں مجھے منظور نہ تھی
کس لیے میں نے تعاقب کیا رسوائی کا

کوئی منظر بھی نگاہوں میں نہیں رک پایا
ایک رشتہ ہے عجب دھند سے بینائی کا

حد مقرر میں سفر کی ابھی کرنے کو تھا
پھر سرا چھوٹ گیا دشت کی پہنائی کا

سمت و رفتار جہاں بدلی گئی
آزمائش کی گھڑی آ ہی گئی

زندگی از سرِ نو سب کو ملی
شرط جینے کی نہیں رکھی گئی

شہر چوراہوں میں تبدیل ہوئے
بھیڑ اتنی نہ کبھی دیکھی گئی

اس سے پہلے بھی ہوئی ہے کوشش
گردشِ وقت کبھی روکی گئی

ہو قلم کار تو تسلیم کرو
تم سے سچ بات نہیں لکھی گئی

دھند کے آگے سپر کیوں ڈالی
کوئی تدبیر نہ کیوں سوچی گئی

کشتیِ جاں سے اتر جانے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

گھر میں یاد آتی تھی کل دشت کی وسعت ہم کو
دشت میں آئے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

کوئی صورت ہو کہ پھر آگ رگ و پے میں بہے
راکھ بننے کو بکھر جانے کو جی چاہتا ہے

کیسی مجبوری و لاچاری ہے اس کوچے میں
جا نہیں سکتا مگر جانے کو جی چاہتا ہے

قرب پھر تیرا میسر ہو کہ اے راحتِ جاں
آخری حد سے گذر جانے کو جی چاہتا ہے

نظمیں

تماشا

جوق در جوق
میرے شہر کے لوگ
جا رہے ہیں کہ آج دیکھیں گے
وہ تماشا کہ جو نہیں دیکھا
اس سے پہلے کسی نے دنیا میں
چند نادان سرپھرے افراد
عمر بھر کی کمائیاں لے کر
اک نئی صبح کی بشارت کے
نشۂ لازوال سے سرشار
چند لمحوں میں بے خبران کی
بادباں کے بغیر کا غذ ناؤ
رات کے بیکراں سمندر کے
پانیوں میں اترنے والی ہے

مرا ساتھ الفاظ

مرا ساتھ الفاظ دے تو رہے ہیں
مری بات تجھ تک پہنچ تو رہی ہے
گئی رات میں دیر تک سو نہ پایا
کئی پچھلی باتیں مجھے یاد آئیں
مری آنکھ پھر سے وہاں اس جگہ تک
تجھے ڈھونڈنے کو گئی
لوٹ آئی
جہاں تیرے ہونے کا امکان تھا
تو نہیں تھی
مگر انگلیوں کی مسلسل وہ حرکت
لبوں پہ وہ مانوس سا ذائقہ
اور سرگوشیوں کا وہ سیلاب
سب کچھ وہی تھا
ترے ہجر کا وصل آثار لمحہ
بڑا مہرباں تھا
مرا ساتھ الفاظ کیوں دے رہے ہیں؟
مری بات تجھ تک پہنچ کیوں رہی ہے؟

ایک میں بھی ہوں

پت جھڑوں کے آنے سے
اور کچھ تو کیا ہوگا
ان گھنے درختوں کے
سائے کے تلے بیٹھے
لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے
لمبی دوریوں والے
اجنبی سفر، جن کو
یہ بھلا چکے ہوں گے
ان کو یاد آئیں گے
لذتِ سفر ان کو
کب یہ سوچنے دے گی
پت جھڑوں کے آنے تک
ان گھنے درختوں نے
دھوپ کی تمازت سے
کتنی کیا حفاظت کی
پت جھڑوں کے آنے کا
خوف جن پہ طاری ہے
ان میں ایک میں بھی ہوں

ہندوستانی دانش وروں کے نام

انھیں زندہ رہنے کی تھی ہوس
جو دکھائی دیتے تھے ہم نفس
کبھی روشنی کے حصار میں
کبھی چیونٹیوں کی قطار میں

حیران کرنے والی ایک بات

ڈوبتی شام کے اُس پار
کھڑے تھے جو لوگ
ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے
کہ ان لوگوں کی
مٹھیاں بند تھیں
یہ ریت کہاں سے آئی؟

تذلیل کی ساعت

میں سامنا اپنا
کرنے سے گریزاں
دیوار پہ چسپاں
گزرے ہوئے کل کی
اک یادِ پشیماں
حق بات کی خاطر
تلوار کے آگے
اک شخص دوزانو
اک شخص جو سب کے
دکھ بانٹ رہا ہے
اور اس پہ ہے نازاں
اک کیڑے کی صورت
دیوار کے نیچے
اب رینگ رہا ہے
یہ شخص وہی ہے

سب آنکھوں نے دیکھا
انجان رہا میں
اس طرح سے میرا
حیران نہ ہونا
ہے فہم سے بالا
دنیا کی طلب نے
جینے کی ہوس نے
تاویل بہت کی
تذلیل کی ساعت
آنی تھی سو آئی

لازوال ہونے کا

رات کی کھلی کھڑکی
بند ہونے والی ہے
چاند کے کٹورے میں
اوس بھرنے والی ہے
یہ عجب سفر اس کا
اب تمام ہوتا ہے
لازوال ہونے کا
دیکھو کیا بہانہ ہے
کل بھی اک حقیقت تھا
آج بھی فسانہ ہے
آسمان کی جانب
سب کے ہاتھ اٹھتے ہیں
اس کے خون کی سرخی
برگ و بار لائے گی
بے نماز بندوں پر
یعنی ان درندوں پر
ہر قدم صلیبوں کا
انتظار لائے گا

کچے رستوں سے . . .

جو کچے رستوں سے پکی سڑکوں کا رُخ کیا تھا
کھڑاؤں اپنی اتار دیتے
بدن کو کپڑوں سے ڈھانپ لیتے
تمہاری سیراب پنڈلیوں پر نشان جتنے ہیں کہہ رہے ہیں
کہ تم نے راتوں کو رات سمجھا
ہر ایک موسم میں اس کی نسبت سے پھل اُگائے
بدن ضرورت غذا ہمیشہ تمہیں ملی ہے
نہ جانے افتاد کیا پڑی ہے
جو کچے رستوں سے پکی سڑکوں کا رُخ کیا ہے

نیند سے سمجھوتا

روز اتنا ہی اگر جاگنا ہے
نیند سے کر لو کوئی سمجھوتا
دیکھو! آنکھوں میں تھکن کے آثار
صاف ظاہر ہیں
اسے کل تم نے
اس طرح دیکھا کہ جیسے کوئی ڈوبنے والا
کنارے کی طرف دیکھتا ہے
اس کی پیشانی کے سورج کا اثر
کوئی آنکھوں پہ نہ تھا
ہاں مگر ناف کے اطراف بہت دیر تلک
یہ بھٹکتی رہیں
آگے جانا ان سے ممکن نہ ہوا
اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا
نیند سے توڑ کے رشتہ تم نے
کوئی اچھا نہ کیا

میں نہیں جاگتا . . .

میں نہیں جاگتا تم جاگو
سیہ رات کی زلف، اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی
بار ہا کر چکا کوشش میں تو
تم بھی اپنی سی کرو
اس تگ ودو کے لیے خواب مرے حاضر ہیں
نیند ان خوابوں کے دروازوں سے لوٹ جاتی ہے
سنو، جاگنے کے لیے ان کا ہونا
سہل کر دے گا بہت کچھ تم پر
آسماں ریگ میں کاغذ کی ناؤ
رک گئی ہے اسے حرکت میں لاؤ
اور کیا کرنا ہے تم جانتے ہو
میں نہیں جاگتا تم جاگو
سیہ رات کی زلف
اتنی الجھی ہے کہ سلجھا نہیں سکتا کوئی

ٹل جائے نہ ساعت کچھ جلدی

سورج کی راکھ بھرو مٹھی
ٹل جائے نہ ساعت کچھ جلدی
وہ لمحہ آنے والا ہے
جس لمحے کی ہمراہی میں
اس شام افق پیشانی پر
اک بوسہ اور چڑھائیں گے
اور رات شجر تک جائیں گے
اور سارے ادھورے خوابوں کو
ان آنکھوں میں بھر لائیں گے
اور جاگ کے رات گزاریں گے
یوں داد جنوں کی پائیں گے
ٹل جائے نہ ساعت کچھ جلدی

آج کے بعد . . .

آج کے بعد دیوارِ جاں کی طرف
مجھ کو جاتے ہوئے دیکھنا
(ایسا ہوگا نہیں پھر بھی گر ایسا ہو)
روک لینا مجھے
میرے ماتھے پہ گرد ندامت کی تحریر کو
خود بھی پڑھنا مجھے بھی سنانا ذرا
اس ندامت میں حصہ تمہارا بھی ہے
وہ گھڑی کسی قیامت کی تھی
مجھ کو تم کو بہت دیر تک
تجربے لوگ اپنے بتاتے رہے
خواب کی اصلیت اور حقیقت کی سچائی میں
فرق کرنے کی تلقین کرتے رہے

میں نے تم نے بڑے غور سے سب سنا
میں نے تم سے یہ پوچھا کہ کیا رائے ہے
تم نے آگے کی جانب اشارہ کیا
ایک ساعت سے آگے کی ساعت تلک لمبا وقفہ تھا
جب وقت میزان سے اس کو ناپا گیا
رات تھی بیکراں رات تھی
میں نے آواز دی تم بھی بولے نہیں
آج کے بعد دیوارِ جاں کی طرف
مجھ کو جاتے ہوئے دیکھنا
ایسا ہوگا نہیں پھر بھی گر ایسا ہو
روک لینا مجھے

زندہ رہنے کا یہ احساس

ریت مٹھی میں کبھی ٹھہری ہے
پیاس سے اس کو علاقہ کیا ہے
عمر کا کتنا بڑا حصہ گنوا بیٹھا میں
جانتے بوجھتے کردار ڈرامے کا بنا
اور اس رول کو سب کہتے ہیں
ہوشیاری سے نبھایا میں نے
ہنسنے کے جتنے مقام آئے ہنسا
بس مجھے رونے کی ساعت پہ خجل ہونا پڑا
جانے کیوں رونے کے ہر لمحے کو
ٹال دیتا ہوں کسی اگلی گھڑی پر
دل میں، خوف و نفرت کو سجا لیتا ہوں
مجھ کو یہ دنیا بھلی لگتی ہے

بھیڑ میں اجنبی لگنے میں مزا آتا ہے
آشنا چہروں کے بدلے ہوئے تیور مجھ کو
حال سے ماضی میں لے جاتے ہیں
کہنیاں زخمی ہیں اور گھٹنوں پر
کچھ خراشوں کے نشاں
سوندھی مٹی کی مہک کھینچے لیے جاتی ہے
تتلیاں، پھول، ہوا، چاندنی، کنکر پتھر
سب مرے ساتھ میں ہیں
سانس بے خوفی سے لیتا ہوں میں

زندگی یہ تو نہیں

لبوں پر میرے
اک تواتر سے کئی نام مچل اٹھتے ہیں
ایک نام ان میں ہر اک نام سے پہلے پھر بعد
زندہ پیکر میں بدل جاتا ہے
میں اسے چھونے کو جب بڑھتا ہوں
کوئی دیوار مرے بیچ میں آجاتی ہے
میں ٹھہر جاتا ہوں
سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں
زندہ ہونے کا یہ احساس بہت کچھ ہے مگر
زندگی یہ تو نہیں

وہ کہاں ہے

مرے اطراف میں اس کے کوئی آثار نہیں

زندہ رہنے کی ریاکاری میں مشاق ہوں

دن ہو یا رات

کس ہنر کتنے سلیقے سے ادا کرتا ہوں یہ رول

تماشائی سب

خضر کی عمر ملے مجھ کو دعا دیتے ہیں

مستحق جس کا نہیں میں

وہ صلہ دیتے ہیں

کیوں خود کو بچا لایا

بنائے تھے ہوس گھیرے
دریچوں میں سجے چہرے
گلی کی آخری حد تک
میں اپنی آنکھ میں نقشہ
کسی اجڑے ہوئے گھر کا
لیے واپس چلا آیا
یہ پچھتاوا اسی کا ہے
کہ کیوں خود کو بچا لایا

افق در کھولنے والی

افق در کھولنے والی
ان انکھوں کو ہوا کیا ہے
پشیمانی کے آنسو
ان کی بینائی کے درپے ہیں
اندھیرے روشنی کے درمیاں
جو فرق قائم تھا
وہی ہے آج بھی، اب بھی
افق در کھولنے والی
یہ آنکھیں اس حقیقت سے گریزاں ہیں
یہ سب کچھ دیکھنے کے واسطے
ہم لوگ ہم جیسے سبھی انساں
خلا کی آخری حد پہ کھڑے ہیں
اور حیراں ہیں

میرا تو ارادہ تھا

میرا تو ارادہ تھا
ہونٹ سیڑھیوں سے میں
آسمان تک جاؤں
تو نے اس جگہ مجھ کو
اتنی دیر تک روکا
یہ بھی بھول بیٹھا میں
میرا کیا ارادہ تھا
اس وجود خاکی میں
جسم کچھ زیادہ تھا

جسم کی کشتی میں آ . . .

ہوا کے پاؤں اس زینے تلک آئے تھے، لگتا ہے
دیئے کی لو پہ یہ بوسہ اسی کا ہے
مری گردن سے سینے تک
خراشوں کی لکیروں کا یہ گلدستہ
طلسمی قفل کھلنے کی اسی ساعت کی خاطر
ہجر کے موسم گزارے ہیں
ہوا نے مدتوں میں پاؤں پانی میں اتارے ہیں
مری پسلی سے پیدا ہو
وہی گندم کی بو لے کر
زمیں اور آسماں کی وسعتیں
مجھ میں سمٹ آئیں
الوہی لذتِ نایاب سے سرشار کر مجھ کو
میں اک پیاسا سمندر ہوں
تو اپنی جسم کی کشتی میں آ
اور پار کر مجھ کو

حرفِ ناگفتنی

شام ڈھلتے ہی مری آنکھوں نے
اک سمندر کے خدوخال گڑھے
رات کی کشتی اتاری اس میں
اک کنارے پہ تجھے بٹھلایا
دوسرے پہ مجھے زنجیر کیا
باوجود اس کے مرے ہونٹوں نے
جسم پر تیرے بہت دیر تلک
حرفِ ناگفتنی تحریر کیا

دریاے خوں

پانی کی لے پہ گاتا
اک کشتیِ ہوا میں
آیا تھا رات کوئی
سارے بدن پہ اس کے
لپٹے ہوئے تھے شعلے
ہونٹوں سے اوس بوندیں
پیہم گرا رہا تھا
سرگوشیوں کے بادل
چھائے ہوئے تھے ہر سو
دریائے خوں رگوں میں
بے تاب ہو رہا تھا
میں ہو رہا تھا پاگل

اس دیوار کو گرتے گرتے

اس دیوار کو گرتے گرتے
جانے کتنی دیر لگے، میں آنکھیں
بند کیے لیتا ہوں اپنی
میرے ہونٹوں پر بارش ہو
تیز موسلا دھار،
چٹانیں اپنی اپنی جگہ سے سرکیں
میں جذبات میں بہتے بہتے رک سا جاؤں
بیچ ندی میں کشتی پھر ہچکولے کھائے
دور کنارے پر دو آنکھیں
میری راہ تکیں، خاموشی
اک لمبی سرگوشی بن کے
ساری سمتوں پر چھا جائے

بھیگے بستر کی شکنوں سے
خوشبو کی لپٹیں سی اٹھیں
میری آنکھیں اس کے آگے
کیوں کچھ دیکھیں؟
اس دیوار کو گرتے گرتے
جتنی دیر لگے، اچھا ہے

بدن کے بند

میں حصارِ آرزو میں مطمئن تھا
تم نے یاد آ کے
بدن کے بند کھولے
آؤ میں تم پر ہوس اسرار کھولوں
لب ترازو میں تمھیں تا دیر تولوں
آخری سسکی تلک میں چپ رہوں اور کچھ نہ بولوں
بس اسی اک کام میں مشاق ہوں میں

وہ موڑ

پھر تری تتلی نما صورت مجھے یاد آ گئی
مجھ کو وہ لمحہ ابھی بھولا نہیں
ایک کونے میں کئی لوگوں کے ساتھ
گفتگو میں منہمک کھویا ہوا
میری آنکھوں نے کبھی تجھ سا کوئی دیکھا نہ تھا
میں تجھے تکنے لگا
دیر تک تکتا رہا
آنکھ سے، کانوں سے، ہونٹوں سے تجھے تکتا رہا
کیا عجب دیوانگی تھی
رشک آیا بخت پہ اپنے مجھے
لفظ کے اسرار مجھ پہ وا ہوئے
گھنٹیاں سی میرے کانوں میں بجیں
نور کے سیلاب میں ڈوبی ہوئی اس شام کی
ایک اک ساعت ترے ہمراہ ہے
رک گیا ہے وقت اس اک موڑ پر
میں جدائی کے لیے مجبور تھا
تو جدائی پر جہاں مسرور تھا

دستکیں

کیسے میرے ذائقے میں ریت شامل ہوگئی
ایک پگڈنڈی سڑک سے جا ملی
میں نے ان آنکھوں سے دیکھا
بے بدن بے نام خواہش کو مجسم روبرو
روح کے زخموں کو سہلانے لگے پھر اس کے ہاتھ
نرم سے نازک سے ہاتھ
میں کسی آگے کی منزل کی طرف بڑھنے کو ہوں
دیر ہوتی جارہی ہے
میرے دل کی دھڑکنوں میں وہ تسلسل کیوں نہیں
اس کے ہونٹوں سے
کسی جھرنے کو گرتے دیکھنے کی
آخری کوشش کروں
نیند کی گولی (مگر دو بوند پانی کون دے)
بند ہوتی کھڑکیوں نے
دیکھو سناٹوں کو توڑا
میرے کانوں میں انڈیلی جارہی ہیں
دستکوں پر دستکیں

آنکھ کا کام ہے . . .

آنکھ کا کام ہے دیوار میں روزن کرنا
دیکھنے کے لیے یہ کھیل کہ انسانوں کو
موت کے سارے ہی اسباب میسر ہیں
مگر زندہ ہیں
ان میں کچھ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہیں، کبھی سینے سے
کبھی پیٹ کے بل
کچھ کہ اجگر ہیں نگل جاتے ہیں جس کو چاہیں
منھ بھی مصروف ہیں ان کے دم بھی
ان کی تعداد زیادہ ہے جو کیڑے ہیں نہ اجگر ہیں
مگر بے حس ہیں
ہم کہ ان میں سے کسی میں بھی نہیں
ہم نے بس اتنا کیا
نور کے نام پہ کچھ دھند مہیا کر کے
آنکھ کے کام کو جاری رکھا
یعنی اس کھیل کی دلچسپی کو قائم رکھا
آنکھ کا کام ہے دیوار میں روزن کرنا

چپکے سے ادھر آ جاؤ

دروازۂ جاں سے ہو کر
چپکے سے ادھر آ جاؤ
اس برف بھری بوری کو
پیچھے کی طرف سرکاؤ
ہر گھاؤ پہ بوسے چھڑکو
ہر زخم کو تم سہلاؤ
میں تاروں تکی اس شب کو
تقسیم کروں یوں سب کو
جاگیر ہو جیسے میری
یہ عرض نہ تم ٹھکراؤ
چپکے سے ادھر آ جاؤ

کھیل کا نتیجہ

کیوں ملال ہے اتنا
ہار جیت میں تم کو
فرق کیوں نظر آیا
کھیل کا نتیجہ تو
کھیلنے کی لذت ہے
جو تمہارے حصے میں
اور لوگوں کی نسبت
کچھ زیادہ آئی ہے
پھر ملال کیسا ہے؟

خوف ساعت

نفرت بھرے اس شہر میں
دن رات کٹتے ہیں مرے
اس خوف کی میعاد کو کم کرنے کے سارے جتن بیکار ہیں
میرے بدن میں خون کی مقدار کتنی ہے مجھے
بتلانے والے ہاتھ بھی لاچار ہیں
ہونٹوں پہ لکنت جم گئی
آنکھوں میں اشکوں کی نمی
پہلے تھی جتنی اب نہیں
کیا خوف ساعت تھم گئی

ہمیں زمین پوچھتی ہے

ہمیں زمین پوچھتی ہے
کوئی کہہ رہا تھا یہ
کون کہہ رہا تھا یہ
تتلیوں کو دھوپ کے عذاب سے
بچانے والے ہاتھ پھر جھلس گئے
بدی کی فصل کے لیے
بہت سا خون چاہیئے
بدن ٹٹول کر ذرا بتایئے
کہاں سے فصد کھولنی ہے
کتنی دیر کا سکوت شرط ہے
چلو یہ مشق بھی کریں
سنیں یہ غور سے سنیں
ہمیں زمین پوچھتی ہے
لوگ کہہ رہے ہیں یہ

تازہ خبر

درندوں کی لڑائی کی
کوئی تازہ خبر جنگل سے آئی ہے
کہ میرے شہر کے لوگوں کے ہونٹوں نے
پرانی ہجرتوں کی داستاں چھیڑی
زمیں کو چھوڑ کر ان کی نگاہیں آسماں کی سمت جاتی ہیں
ہوا سر کھولے پیہم بین کرتی ہے
مرے کانوں نے آنکھوں نے
مجھے لاکر کہاں چھوڑا
کوئی تازہ خبر جنگل سے آئی ہے

سنکھ بجنے کی گھڑی

آنکھ مندر کے کلس پر رکھو
سنکھ بجنے کی گھڑی آتی ہے
دیوداسی کے قدم رک رک کر
آگے بڑھتے ہیں
زمیں کے نیچے
گائے کو سینگ بدلنے کی بڑی جلدی ہے
بوالہوس آنکھوں نے پھر جال بنا
رال ٹپکاتی زباں پھر ہوئی مصروف سفر
جسم کے کھردرے کچھ نرم علاقوں کا سفر
سادھنا بھنگ نہ ہو اب کے بھی
زور سے چیخ کے اشلوک
پجاری نے پڑھے
آنکھ مندر کے کلس پر رکھی

بارِ گرد

پاس کی لمبی سڑک
میرے قدموں کے تلے
آنے والی تھی، نہیں آئی
مجھے رات نے کل
نیند سے گھیر لیا
کیا عجب رات تھی، نادر نایاب
سرمئی شال میں لپٹی ہوئی
شرمائی ہوئی
میری باہوں کی تمنائی
مرے جسم کی سرگوشی کی منتظر
مجھ پہ نثار
میرے ہونٹوں کو چھوا انگلی سے
اور پھر بوسوں کی
تیز بارش میں شرابور کیا

ایسا لطف، اتنا کرم
دل کو احساس ہوا
زیست کرنے کا کوئی مصرف ہے
مہرباں بارِ دگر رات ہو
میں چاہتا ہوں
آج یہی چاہتا ہوں

ہونٹوں سے نہیں لکھی

آج صاف پانی پر
انگلیوں سے لکھی ہے
تیرے نام اک چٹھی

آئے اب ہوا آئے
اور صاف پانی کو
تیری سمت لے جائے

راستے میں ہاں اس کو
اور کوئی نہ پڑھ پائے
ہو نہ تیری رسوائی

تیرے نام یہ چٹھی
ہونٹوں سے نہیں لکھی
انگلیوں سے لکھی ہے

میں تجھ سے تو مجھ سے خائف

میرے ہونٹ پہ دو قطرے ہیں
تیرے پاس سمندر ہے
میری آنکھ جدھر بھی دیکھے
تیرا جسم منور ہے
میں تجھ سے تو مجھ سے خائف
بس اتنا سا انتر ہے
تو جب چاہے رُک سکتی ہے
طاقت تیرے اندر ہے
خود کو اپنی حد میں رکھنا
میرے بس سے باہر ہے

ہوس سوا کوئی نہیں

تمہارے میرے درمیاں
ہوس سوا کوئی نہیں
تمہیں بھی اس کا علم ہے
خبر مجھے بھی اس کی ہے
کبھی تم اپنے جسم سے
الگ مجھے ملو کہیں
کہ میں تو اپنے جسم سے
جدا کبھی ہوا نہیں

اس کا سبب یہ آنکھیں ہیں

یہ دیوار ہماری دشمن
ہم جیسے ہر شخص کی دشمن
اس کا سبب یہ آنکھیں ہیں
جو دیوار میں روزن کر کے
اس دیوار کی اُس جانب کی
حرکت و نقل کی سب تفصیلیں
خلق کے سامنے لاتی ہیں

مات پھر کھائے گا

ایک دو دن تک رہے گا
تجھ کو جدائی کا ملال
وقت کے آگے تری ہستی ہی کیا ہے
چل دیکھ چال
مات پھر کھائے گا
اپنے کو سنبھال

پیاس سے رہائی

شب کی ساری صراحیاں خالی
ہو چکیں جب، تو صبح کا سورج
میرے ہونٹوں کے پاس آیا، کہا
"رات کو قطرہ قطرہ پینے سے
پیاس بجھتی نہیں ہے بڑھتی ہے
ثبت کر ہونٹ میرے ہونٹوں پر
اور اس پیاس سے رہائی پا"

جسم نے دہائی دی

تمہاری بات ماننے کو
سوچ ہی رہا تھا میں
خمارِ شب کے ٹوٹنے پہ
جسم نے دہائی دی
"مجھے بچاؤ" کی صدا
جو پاس سے سنائی دی
کوئی بھی شے نہ پھر مجھے دکھائی دی

بزدل ہونے کا خمیازہ

اتنی دیر تلک آنکھوں نے
رات تجھے سپنے میں دیکھا
تجھ کو چھونے کی خواہش کو
کتنی دشواری سے ٹالا
بزدل ہونے کا خمیازہ
میں نے سپنے میں بھی بھگتا

مری آنکھ خوف تہی رہی

چلی رات بادِ ہوس عجب
جو چراغ ترے خیال کے
بڑی خامشی سے بجھا گئی
کوئی گونج شہر فلک میں تھی
تری شکل بند پلک میں تھی
نئے حادثات کی منتظر
مری آنکھ
خوف تہی رہی

چلو تم کو ...

نکیلے ناخنوں سے اپنی قبریں کھودتے جاؤ
تھکن سے چور چہروں پر
ابھی تک شرم کے آثار باقی ہیں
اندھیروں کے کسی پاتال میں
اترے چلے جاؤ
تمہارے رتجگوں نے نیند کو پامال کر ڈالا
تخی آنکھوں کے اشکوں نے تمہیں کنگال کر ڈالا
تمہاری بے دلی کا کرب اب دیکھا نہیں جاتا
چلو تم کو کسی ایک گھومتی کرسی پہ بٹھلا دیں

تم مرے پاس ...

تم مرے پاس بہت دیر سے ہو
دستِ مہتاب نے پیشانی پر
پھر وہی لکھا ہے، جو آخر شب
روز لکھتا ہے، جسے جان کے
پڑھتے نہیں تم
اور مجھے پڑھنے پہ اکساتے ہو
تم مرے پاس بہت دیر سے ہو

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فریاد

مجاوروں کی بھیڑ نے
مجھے پھر ایک قبر میں بدل دیا
میں کہہ رہا ہوں دیر سے، میں زندہ ہوں
مری صدا میں بازگشت کیوں نہیں
مرے خدا مجھے سزائیں جتنی دے
پہ یوں نہیں

روز کی مانند

ہاتھ حرکت میں ہیں
لب ہلتے ہیں
اور آنکھوں میں
سراسیمگی
آئینے میں
آج بھی روز کی مانند نظر آتا ہوں

... آگے بہت آگے آگیا

میں اس سفر میں آگے بہت آ گیا
پیچھے مڑا
تو پیروں کے نیچے کی یہ زمیں
مجھ سے حساب مانگے گی فصلوں کا
جن کو میں
بونا تو چاہتا تھا مگر بو نہیں سکا
دریوزہ گر کی طرح کسی موڑ کے قریب
عمرِ عزیز میں نے بسر کی کچھ اس طرح
آئندہ آنے والے دنوں کے خیال میں
میں نے کبھی بھی حال کی جانب نہ کی نظر
مٹی کا رنگ دیکھا
نہ اس کی صدا سنی

عجلت شعار اتنی طبیعت تھی

رات دن

اک دور کی صدا کی طرف بھاگتا رہا

جب خواب دیکھنے تھے تو میں جاگتا رہا

یوں اس طرح سے آگے بہت آگے آ گیا

آخری کوشش تو کرنی ہے

مانا ہیں شل ہاتھ تمہارے
مانا ہیں پتوار پرانے
مانا ساحل دور بہت ہے
مانا دریا ہے طوفانی
کشتی پار نہیں ہونے کی
آخری کوشش تو کرنی ہے

رات کے آخری کنارے سے

زرد پتے نحیف شاخوں پر
رات کے آخری کنارے سے
آنے والی مہیب آندھی کا
دیکھ لو، انتظار کرتے ہیں
لوگ سب اس عجیب منظر کو
بے ضرر کیوں شمار کرتے ہیں

آخری دُعا مانگنے کو ہوں ...

آخری دُعا مانگنے کو ہوں
آسمان پر، رات کے سوا کچھ نہیں رہا
کون مٹھیاں ریت سے بھرے
پانیوں کا رخ، شہر کی طرف، اب نہیں رہا
کتنے مطمئن لوگ آج ہیں
دیر رات تک، جاگنے کا غم
اب انھیں نہیں
میں بھی چاند کا منتظر نہیں
دل زمین سے اس کے نقش پا سارے مٹ گئے
خواب دیکھنا ترک کر چکا
کس سکون سے سو رہا ہوں میں
ایسا کیوں ہوا
آگ جسم کب برف ہو گیا

سوچتا ہوں میں
اور سوچ کر، اپنے آپ کے اس زوال پر
کچھ اداس سا ہو رہا ہوں میں
آسمان پر، رات کے سوا کچھ نہیں رہا
آخری دُعا مانگنے کو ہوں

میری رسوائی ...

سناٹوں سے بھری بوتلیں بیچنے والے
میری کھڑکی کے نیچے پھر کھڑے ہوئے ہیں
اور آوازیں لگا رہے ہیں

بستر کی شکنوں سے نکلوں
نیچے جاؤں
ان سے پوچھوں
میری رسوائی سے ان کو کیا ملتا ہے
میرے پاس کوئی بھی کہنے والی بات نہیں ہے
سننے کی طاقت بھی کب کی گنوا چکا ہوں

شام ہونے والی ہے

(۲۰۰۴)

وجے کمار بجاج

کے نام

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

حرفِ آغاز

یہ میرا چھٹا مجموعہ ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ شاعری ہے جو میں نے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد کی۔ ملازمت کے دوران میں نے کمیت کے اعتبار سے زیادہ شاعری کی۔ شعر کہنے کی رفتار کے سست ہونے کا سبب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے اس مسئلہ پر گفتگو کسی اور وقت کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں۔

اس مجموعے کی ترتیب اور پریس کاپی تیار کرنے کی ذمہ داری عزیزی مہتاب حیدر نقوی نے لی اور بخوبی اس کو پورا کیا، آپ لوگ خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں؛ عزیزی امتیاز احمد نے عکس و شخص کے عنوان سے تحریروں کا ایک کولاژ تیار کیا جو آخر میں شامل ہے [اس کتاب میں کولاژ کی بیشتر تحریریں مختلف مجموعوں کے دیباچوں اور تبصروں میں درج ہیں۔ تکرار کی وجہ سے کولاژ کو یہاں شامل نہیں کیا گیا۔ ادارہ]

پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور مہتاب حیدر نقوی نے میرے اصرار پر اس کتاب کے مشمولات کو غیر جانب داری سے دیکھا۔ سرورق پر میری تصویر صدیق احمد صدیقی کی کھینچی ہوئی ہے۔ [یہی تصویر اس کتاب کے سرورق پر ہے۔ ادارہ] اسم اعظم اور ساتواں در پر بھی انہیں کی کھینچی ہوئی تصویریں تھیں۔ ان سب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ۔

شہریار

۱۰۱ سفینہ کمپلیکس، میڈیکل روڈ علی گڑھ

مغنی تبسم کے نام

اے عزیز از جان مغنی
تیری پرچھائی ہوں لیکن کتنا اتراتا ہوں میں
اعظمی[1] کا مرنا، نجمہ[2] کا بچھڑنا
تیرے بل بوتے پہ یہ سب سہ گیا
بھول کر بھی یہ خیال آیا نہیں مجھ کو
کہ تنہا رہ گیا
تیری الفت میں عجب جادو اثر ہے
تیری پرچھائیں رہوں جب تک جیوں
یہ چاہتا ہوں
اے خدا
چھوٹی سی کتنی بے ضرر یہ آرزو ہے
آرزو یہ میں نے کی ہے
اس بھروسے پر کہ تو ہے

---

[1] خلیل الرحمٰن اعظمی

[2] نجمہ شہریار

غزلیں

○○○

دل میں طوفان ہے اور آنکھوں میں طغیانی ہے
زندگی ہم نے مگر ہار نہیں مانی ہے

غم زدہ وہ بھی ہیں دشوار ہے مرنا جن کو
وہ بھی شاکی ہیں جنھیں جینے کی آسانی ہے

دور تک ریت کا تپتا ہوا صحرا تھا جہاں
پیاس کا کس کی کرشمہ ہے وہاں پانی ہے

جستجو تیرے علاوہ بھی کسی کی ہے ہمیں
جیسے دنیا میں کہیں کوئی ترا ثانی ہے

اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں
حاصلِ سیرِ جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

○○○

شکوہ کوئی دریا کی روانی سے نہیں ہے
رشتہ ہی مری پیاس کا پانی سے نہیں ہے

کل یوں تھا کہ یہ قید زمانی سے تھے بیزار
فرصت جنہیں اب سیرِ مکانی سے نہیں ہے

چاہا تو یقیں آئے نہ سچائی پہ اس کی
خائف کوئی گل عہدِ خزانی سے نہیں ہے

دہراتا نہیں میں بھی گئے لوگوں کی باتیں
اس دور کو نسبت بھی کہانی سے نہیں ہے

کہتے ہیں مرے حق میں سخن فہم بس اتنا
شعروں میں جو خوبی ہے معانی سے نہیں ہے

○○○

جو برا تھا کبھی اب ہو گیا اچھا کیسے
وقت کے ساتھ میں اس تیزی سے بدلا کیسے

جن کو وحشت سے علاقہ نہیں وہ کیا جانیں
بیکراں دشت مرے حصے میں آیا کیسے

کوئی اک آدھ سبب ہوتا تو بتلا دیتا
پیاس سے چھوٹ گیا پانی کا رشتہ کیسے

حافظے میں مرے بس ایک کھنڈر سا کچھ ہے
میں بناؤں تو کسی شہر کا نقشا کیسے

بارہا پوچھنا چاہا کبھی ہمت نہ ہوئی
دوستو راس تمھیں آئی یہ دنیا کیسے

زندگی میں کبھی اک پل ہی سہی غور کرو
ختم ہو جاتا ہے جینے کا تماشا کیسے

○○○

تمام شہر میں جس اجنبی کا چرچا ہے
سبھی کی رائے ہے وہ شخص میرے جیسا ہے

بلاوے آتے ہیں کتنے دنوں سے صحرا سے
میں کل یہ لوگوں سے پوچھوں گا کس کو جانا ہے

کبھی خیال یہ آتا ہے کھیل ختم ہوا
کبھی گمان گذرتا ہے ایک وقفہ ہے

سنا ہے ترکِ جنوں تک پہنچ گئے ہیں لوگ
یہ کام اچھا نہیں پر مآل اچھا ہے

یہ چل چلاؤ کے لمحے ہیں اب تو سچ بولو
جہاں نے تم کو کہ تم نے جہاں کو بدلا ہے

پلٹ کے پیچھے نہیں دیکھتا ہوں خوف سے میں
کہ سنگ ہوتے بہت دوستوں کو دیکھا ہے

○○○

جو کہتے تھے کہیں دریا نہیں ہے
سنا ان سے کوئی پیاسا نہیں ہے

دیا لیکر وہاں ہم جا رہے ہیں
جہاں سورج کبھی ڈھلتا نہیں ہے

نہ جانے کیوں ہمیں لگتا ہے ایسا
زمیں پر آسماں سایہ نہیں ہے

تھکن محسوس ہو رک جانا چاہیں
سفر میں موڑ وہ آیا نہیں ہے

چلو آنکھوں میں پھر سے نیند بوئیں
کہ مدت سے اسے دیکھا نہیں ہے

○○○

تیرے آنے کی خبر آتے ہی ڈر لگنے لگا
غیر کا لگتا تھا جو وہ اپنا گھر لگنے لگا

کیا حریفوں میں مرے سورج بھی شامل ہوگیا
زرد پتہ راستے کا کیوں شجر لگنے لگا

یاد آنا تھا کسی اک نقرئی آواز کا
پھر سے سناٹوں کا مجمع بام پر لگنے لگا

میں سلامت ہوں مگر یہ خواب آنکھیں کربلا
جو جدا تن سے ہوا وہ میرا سر لگنے لگا

جانے کیا افتاد پڑنے کو ہے مجھ پر دوستو
معتبر لوگوں کو میں اب معتبر لگنے لگا

○○○

قرار ہجر میں آیا سکون درد کے ساتھ
بڑا عجیب سا رشتہ ہے ایک فرد کے ساتھ

طلوع ہوتا ہے دن اس لیے کہ دھند بڑھے
ہر ایک رات ہے منسوب ماہِ زرد کے ساتھ

سمٹ رہا ہے علاقہ ہماری وحشت کا
ہے اعتراف ہمیں اس کا رنج و درد کے ساتھ

اسی کی شرطوں پہ طے باقی کا سفر ہوگا
یہ عہد کل ہی کیا راستے کی گرد کے ساتھ

ہے کوئی جو کبھی پوچھے یہ جا کے سورج سے
کہ اور رہنا ہے کب تک ہوائے سرد کے ساتھ

○○○

اب وقت جو آنے والا ہے کس طرح گزرنے والا ہے
وہ شکل تو کب سے اوجھل ہے، یہ زخم بھی بھرنے والا ہے

دنیا سے بغاوت کرنے کی اس شخص سے امیدیں کیسی
دنیا کے لیے جو زندہ ہے دنیا سے جو ڈرنے والا ہے

آدم کی طرح آدم سے ملے، کچھ اچھے سچے کام کرے
یہ علم اگر ہو انساں کو کب کیسے مرنے والا ہے

دریا کے کنارے پر اتنی یہ بھیڑ یہی سن کر آئی
اک چاند بنا پیراہن کے پانی میں اترنے والا ہے

○○○

میں دکھی ہوں سب یہ کہتے ہیں خوشی کی بات ہے
اب اندھیروں کی زباں پر روشنی کی بات ہے

مدتوں پہلے جدا ہم اپنی مرضی سے ہوئے
لگ رہا ہے دل کو یوں جیسے ابھی کی بات ہے

ہم نے جب بھی داستانِ شوق چھیڑی دوستو
ہر کسی کو یہ لگا جیسے اسی کی بات ہے

خامشی نے کس لیے آواز کا پیچھا کیا
اہلِ دنیا تم نہ سمجھو گے یہ ایسی بات ہے

شہر میں اک شخص ایسا ہے، جو سچ کے ساتھ ہے
دھیان سے کیوں سن رہے، ہو دل لگی کی بات ہے

○○○

تم کو مبارک شامل ہونا بنجاروں میں
بستی کی عزت نہ ڈبونا بنجاروں میں

ان کے لیے یہ دنیا ایک عجائب گھر ہے
حرص و ہوس کے بیج نہ بونا بنجاروں میں

اپنی اداسی اپنے ساتھ میں مت لے جانا
نامقبول ہے رونا دھونا بنجاروں میں

ان کے یہاں یہ رات اور دن کا فرق نہیں ہے
ان کی آنکھ سے جاگنا، سونا بنجاروں میں

یکساں اور مساوی حصہ سب کو دینا
جو کچھ بھی تم پانا کھونا بنجاروں میں

ہجرت کی خوشبو سے ان کی روح بندھی ہے
ہجرت سے بیزار نہ ہونا بنجاروں میں

○○○

سنتا ہوں اب تو نہیں انکاری اس بات سے
کوئی نسبت تھی کبھی تجھ کو مری ذات سے

تو میرے ہمراہ تھا دروازے تک شام کے
اس کے آگے کیا ہوا پوچھا جائے رات سے

پچھلی بارش میں مجھے خواہش تھی سیلاب کی
اب کے تو بتلا مجھے کیا مانگوں میں برسات سے

کام آئے جو ہجر کے ہر آئندہ موڑ پر
ایسا اک تحفہ مجھے دے تو اپنے ہاتھ سے

ہاں مجھ کو بھی دیکھ لے جینے کی لت پڑ گئی
ہاں تو نے بھی کر لیا سمجھوتہ حالات سے

○○○

جو بات کرنے کی تھی کاش میں نے کی ہوتی
تمام شہر میں اک دھوم سی مچی ہوتی

بدن تمام گلابوں سے ڈھک گیا ہوتا
مرے لبوں نے اگر آبیاری کی ہوتی

بس اتنا ہوتا مرے دونوں ہاتھ بھر جاتے
ترے خزانے میں بتلا کوئی کمی ہوتی

فضا میں دور تلک سانسوں کے شرر اڑتے
زمیں پہ دور تلک چاندنی بچھی ہوتی

میں اس طرح نہ جہنم کی سیڑھیاں چڑھتا
ہوس کو میری جو تو نے ہوا نہ دی ہوتی

○○○

کسی کلی، کسی مہتاب میں نہاں ہوگا
میں دشت میں ہوں تو اس وقت تو کہاں ہوگا

اسی امید پہ کاٹا ہے یہ پہاڑ سا دن
کہ شب کو خواب میں تو مجھ پہ مہرباں ہوگا

تو اپنے طور سے طے کر وصال کی منزل
تری طرف سے مرا دل نہ بدگماں ہوگا

جو اس سے اہلِ زمانہ نے ہاتھ کھینچ لیا
ضرور کارِ محبت میں کچھ زیاں ہوگا

یہ اہلِ شہر نے اک بار بھی نہیں سوچا
ذرا سی آگ سے چاروں طرف دھواں ہوگا

○○○
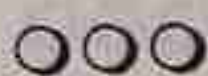
جانے کیا دیکھا تھا میں نے خواب میں
پھنس گیا پھر جسم کے گرداب میں

تیرا کیا، تو تو برس کر کھل گیا
میرا سب کچھ بہہ گیا سیلاب میں

میری آنکھوں کا بھی حصہ ہے بہت
تیرے اس چہرے کی آب و تاب میں

تجھ میں اور مجھ میں تعلق ہے وہی
ہے جو رشتہ ساز اور مضراب میں

میرا وعدہ ہے کہ ساری زندگی
تجھ سے میں ملتا رہوں گا خواب میں

○○○

اس جگہ ٹھہروں یا وہاں سے سنوں
میں ترے جسم کو کہاں سے سنوں

مجھ کو آغاز داستاں ہے عزیز
تیری ضد ہے کہ درمیاں سے سنوں

تیر نے آج کیا شکار کیا
اس کی تفصیل میں کماں سے سنوں

رات کیا کچھ زمین پر بیتی
پہلے تجھ سے پھر آسماں سے سنوں

کتنی معصوم سی تمنا ہے
نام اپنا تری زباں سے سنوں

○○○

عبادت رات دن اک شخص کی ایسے نہیں کی تھی
کھلا ہم نے محبت آج سے پہلے نہیں کی تھی

وفا کرنے کی عادت تھی سو ہم کرتے رہے سب سے
کسی مطلب سے یا انعام کے بدلے نہیں کی تھی

بس اک کوندہ سا لپکا اور خیرہ ہوگئیں آنکھیں
تری جانب نظر ہم نے ارادے سے نہیں کی تھی

بسر یہ عمر ہم نے اپنی مرضی کے مطابق کی
بسر کرتے ہیں جیسے لوگ یاں ویسے نہیں کی تھی

○○○

میں نے جس کو کبھی بھلایا نہیں
یاد کرنے پہ یاد آیا نہیں

عکس مہتاب سے مشابہ ہے
تیرا چہرہ تجھے بتایا نہیں

تیرا اجلا بدن نہ میلا ہو
ہاتھ تجھ کو کبھی لگایا نہیں

زد میں سرگوشیوں کی پھر تو ہے
یہ نہ کہنا تجھے جگایا نہیں

باخبر میں ہوں تو بھی جانتا ہے
دور تک اب سفر میں سایہ نہیں

○○○

تمہارے شہر میں کچھ بھی ہوا نہیں ہے کیا
کہ تم نے چیخوں کو سچ مچ سنا نہیں ہے کیا

تمام خلقِ خدا اس جگہ رکی کیوں ہے
یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے کیا

لہولہان سبھی کر رہے ہیں سورج کو
کسی کو خوف یہاں رات کا نہیں ہے کیا

میں ایک عرصے سے حیران ہوں کہ حاکمِ شہر
جو ہو رہا ہے اسے دیکھتا نہیں ہے کیا

اجاڑتے ہیں جو ناداں، اسے اجڑنے دو
کہ اجڑا شہر دوبارہ بسا نہیں ہے کیا

○○○

یوں منجل ہونا نہ پڑتا دوستو انکار پر
کوئی پابندی لگی ہوتی اگر اظہار پر

نام اب تک دے نہ پایا اس تعلق کو کوئی
جو مرا دشمن ہے کیوں روتا ہوں اس کی ہار پر

دھوپ سے بچنے کی کوشش میں کٹے گی رات بھی
کوئی شک کر کے تو دیکھے سایۂ اشجار پر

شہر کی جانب نہ ہونے پائے سناٹوں کا رخ
ہے مری آواز راضی آج اس بیگار پر

بارشیں ان پڑھ تھیں پچھلے نقش سارے دھو دیے
ہاں تری تصویر جیوں کی تیوں ہے دل دیوار پر

○○○

اسے گناہ کہیں یا کہیں ثواب کا کام
ندی کو سونپ دیا پیاس نے سراب کا کام

ہم ایک چہرے کو ہر زاویے سے دیکھ سکیں
کسی طرح سے مکمل ہو نقشِ آب کا کام

ہماری آنکھیں کہ پہلے تو خوب جاگتی ہیں
پھر اس کے بعد وہ کرتی ہیں صرف خواب کا کام

وہ رات کشتی کنارے لگی کہ ڈوب گئی
ستارے نکلے تو تھے کرنے ماہتاب کا کام

فریب خود کو دیے جا رہے ہیں اور خوش ہیں
اسے خبر ہے کہ دشوار ہے حجاب کا کام

○○○

تجھ کو کھو کر کیوں یہ لگتا ہے کہ کچھ کھویا نہیں
خواب میں آئے گا تو اس واسطے سویا نہیں

آپ بیتی پر جہاں ہنسنا تھا جی بھر کے ہنسا
ہاں جہاں رونا ضروری تھا وہاں رویا نہیں

موسموں نے پچھلی فصلوں کی نگہبانی نہ کی
اس لیے اب کے زمینِ دل میں کچھ بویا نہیں

وقت کے ہاتھوں نے جتنے داغ تھے سب دھو دیے
داغ جو تجھ سے ملا ہے اک اسے دھویا نہیں

کیسی محفل ہے یہاں میں کس طرح سے آ گیا
سب کے سب خاموش بیٹھے ہیں کوئی گویا نہیں

○○○

کہیں ذرا سا اندھیرا بھی کل کی رات نہ تھا
گواہ کوئی مگر روشنی کے ساتھ نہ تھا

سب اپنے طور سے جینے کے مدعی تھے یہاں
پتہ کسی کو مگر رمز کائنات نہ تھا

کہاں سے کتنی اڑے اور کہاں پہ کتنی جمے
بدن کی ریت کو اندازۂ حیات نہ تھا

مرا وجود منور ہے آج بھی اس سے
وہ تیرے قرب کا لمحہ جسے ثبات نہ تھا

مجھے تو پھر بھی مقدر پہ رشک آتا ہے
مری تباہی میں ہر چند تیرا ہاتھ نہ تھا

○○○

فضائیں دھند سے سرگوشیوں کی اور اَٹ جائیں
بدن کی یہ چٹانیں، ممکنہ حد تک سمٹ جائیں

سمندر تہہ تلک جانا بہت آسان ہو جائے
اگر گوہر بھری یہ سیپیاں اک پل کو ہٹ جائیں

بتا سکتا ہے کوئی وہ مسافر کون ہوتے ہیں
جو اک رستے سے آئیں اور دو سمتوں میں بٹ جائیں

نہ جانے آنے والا وقت کیوں دشمن سا لگتا ہے
ہوائیں آ کے پھر اوراقِ ماضی کے پلٹ جائیں

مناسب وقت ہے جنسِ سخن کو بیچ دینے کا
خبر کس کو ہے اس کے بھاؤ کب اور کتنے گھٹ جائیں

○○○

میں پیاسا اور بھی پیاسا تھا اور سیراب تھا وہ
سمندر میں جسے سمجھا تھا اک سیلاب تھا وہ

زمیں پر زینہ زینہ دیر تک اترے ستارے
مری آنکھوں کا کوئی وہم تھا یا خواب تھا وہ

میں اس کی تیز سانسیں سن رہا تھا نغمہ جیسے
مری اس زندگی کا لمحۂ نایاب تھا وہ

لبوں سے دھوم بارش آسماں تک جاتی موجیں
بدن کشتی مسافر کے لیے گرداب تھا وہ

مجھے راس آ گئی تھی آخرش دوری کی قربت
مرا رخ پھر تھا صحرا سمت محوِ خواب تھا وہ

OOO

شہرت ہی ملی ہے دیکھو سدا رسوائی میں
ہم اتنے بڑے ماہر ہیں زخم نمائی میں

کچھ دور ہی آئے ہونگے ہم یہ دھیان آیا
کیوں لمبے سفر پر نکلے آبلہ پائی میں

یہ روح بدن دیوار گرانا چاہتی تھی
اور جسم رہا مصروف ہوس پیدائی میں

رکنے کے مقام جہاں بھی آئیں رک جاؤ
یوں زینہ بہ زینہ اترو دل گہرائی میں

پانی پہ لکھی تحریریں جلدی پڑھ ڈالو
ممکن ہے خلل آجائے پھر بینائی میں

○○○

کچھ دیر رہی ہلچل مجھ پیاس سے پانی میں
پھر تھی وہی جولانی دریا کی روانی میں

یہ ہجر کی راتیں بھی ہوتی ہیں عجب راتیں
دن پھول کھلے دیکھے کل رات کی رانی میں

آنکھیں وہیں ٹھہری ہیں پہلے جہاں ٹھہری تھیں
ویسا ہی حسیں ہے تو تھا جیسا جوانی میں

دلچسپی جو دنیا کو ہے مجھ میں رہے قائم
اک موڑ نیا آئے اب میری کہانی میں

میٹھی ہے کہ کڑوی ہے سچائی بس اتنی ہے
رہنا ہے رہائی تک اس قید مکانی میں

○○○

چاہتا کچھ ہوں مگر لب پہ دعا ہے کچھ اور
دل کے اطراف کی دیکھو تو فضا ہے کچھ اور

جو مکاں دار ہیں دنیا میں انہیں کیا معلوم
گھر کی تعمیر کی حسرت کا مزا ہے کچھ اور

جسم کے ساز پہ سنتا تھا عجب سا نغمہ
روح کے تاروں کو چھیڑا تو صدا ہے کچھ اور

پیش گوئی پہ نجومی کی بھروسا کیسا
وقت کے دریا کے پانی پہ لکھا ہے کچھ اور

تو وفا کیش ہے جی جان سے چاہا ہے تجھے
تیرے بارے میں یہ لوگوں سے سنا ہے کچھ اور

OOO

یہ کیا ہوا کہ خموشی بھی گنگنانے لگی
گئی رتوں کی ہر اک بات یاد آنے لگی

زمینِ دل پہ کئی نور کے منارے تھے
خیال آیا کسی کا تو دھند چھانے لگی

خبر یہ جب سے پڑھی ہے خوشی کا حال نہ پوچھ
سیاہ رات تجھے روشنی ستانے لگی

دلوں میں لوگوں کے ہمدردیاں ہیں میرے لیے
میں آج خوش ہوں کہ محنت مری ٹھکانے لگی

برا کہو کہ بھلا سمجھو، یہ حقیقت ہے
جو بات پہلے رلاتی تھی اب ہنسانے لگی

○○○

کبھی اپنے سے مجھ کو خوش گماں ہونے نہیں دو گے
کہ تم محنت کو اپنی رائگاں ہونے نہیں دو گے

مسافر کی طرح آؤ گے اک دن دل سرائے میں
رہو گے اس طرح اس کو مکاں ہونے نہیں دو گے

مری کشتی کو جب منجدھار میں لائے تو کہہ دیتے
سوا اپنے کسی کو بادباں ہونے نہیں دو گے

بہت سے موڑ دانستہ نہیں آنے دیئے میں نے
کہانی کو مری تم داستاں ہونے نہیں دو گے

○○○

دنیا میں کہیں ہے بھی نہیں بھی ہے عجب ہے
مدت سے ہمیں ایسی ہی اک شے کی طلب ہے

اے دوست مگر پہلے سی وہ بات نہیں ہے
یوں ہونے کو اس بزم میں جو چاہیے سب ہے

لگتا ہے کہ حائل ہے کوئی ریت کا صحرا
کہنے کو وہی پیاس، وہی چشمۂ لب ہے

یہ شہر جنوں پھر بھی نہیں چھوٹتا ہم سے
وہ مرنے کا انداز نہ جینے کا وہ ڈھب ہے

وہ دور، ادھر نور کی شمعیں ہیں فروزاں
اے رات کی تاریکی تجھے روکنا اب ہے

○○○

بجھنے کے بعد جلنا گوارا نہیں کیا
ہم نے کوئی بھی کام دوبارا نہیں کیا

اچھا ہے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے یہ
دنیا نے کیوں خیال ہمارا نہیں کیا

جینے کی لت پڑی نہیں شاید اسی لیے
جھوٹی تسلیوں پہ گزارا نہیں کیا

یہ سچ اگر نہیں تو بہت جھوٹ بھی نہیں
تجھ کو بھلا کے کوئی خسارا نہیں کیا

○○○

نسبت رہے تم سے سدا حضرت نظام الدین جی
مانگوں میں کیا اس کے سوا حضرت نظام الدین جی

آنکھوں پہ یوں چھائے ہو تم، ہر جا نظر آئے ہو تم
کیسا جنوں مجھ کو ہوا حضرت نظام الدین جی

ہاتھوں سے تم نے جو کیا روشن وفا کا اک دیا
آندھی کی زد میں وہ جلا حضرت نظام الدین جی

لیتے تھے اللہ نام جو، جپتے تھے دل میں رام جو
تم نے کیا سب کا بھلا حضرت نظام الدین جی

خسرو کی آنکھوں سے کبھی دیکھے اگر تم کو کوئی
احوال ہوگا اس کا کیا حضرت نظام الدین جی

○○○

تری جدائی میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے
کہیں پہ تو کہیں تجھ سا دکھائی دیتا ہے

زمانہ ہو گیا ایسے کسی سفر میں ہوں
کہ اب نہ موڑ نہ رستا دکھائی دیتا ہے

الجھ رہی ہے بہت مجھ سے میرے پاؤں کی گرد
قدم قدم پہ تماشا دکھائی دیتا ہے

عجیب وقت سنو آپڑا ہے سورج پر
طلوع ہوتا نہ ڈھلتا دکھائی دیتا ہے

یہ میری آنکھیں نہیں دوسروں کی آنکھیں ہیں
اندھیرا ہے پہ اجالا دکھائی دیتا ہے

○○○

آنکھ کھلے شاداب سا اک چہرا دیکھوں
بیچ سے تو ہٹ جائے تو کیا کیا دیکھوں

آنسو اوس میں بھیگنے والے یہ رستے
منزل تک لے جائیں یہ سپنا دیکھوں

آنکھوں پر یہ قہر بھی نازل ہونا تھا
دل دیوار کا خوفزدہ سایا دیکھوں

اک کمزور سے لمحے میں یہ خواہش کی
تجھ کو اکیلا اور بہت تنہا دیکھوں

پانی کی جس بوند سے میرا رشتہ ہے
پانی کی اس بوند کو میں پیاسا دیکھوں

ایسی کالی لمبی رات ملی مجھ کو
ہاں چاہا تھا سورج کو ڈھلتا دیکھوں

میرے مالک مجھ کو اتنی مہلت دے
نئے سرے سے میں تیری دنیا دیکھوں

○○○

ایک امید ہے جو دل میں مکیں ہوگئی ہے
دیکھتے دیکھتے یہ دنیا حسیں ہوگئی ہے

در تو اک آیا تھا ٹھہرا نہیں میں دیر تلک
جیسے سجدوں سے تہی میری جبیں ہوگئی ہے

تجھ سے بچھڑا تھا جہاں تیرے کہے پر اک دن
مری پرچھائیں جدا مجھ سے وہیں ہوگئی ہے

ایسا لگتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہونے والا
کوئی انہونی سی اک بات کہیں ہوگئی ہے

آسماں تجھ میں کشش بھی نہیں پہلے والی
اور کچھ یوں ہے کہ بہتر یہ زمیں ہوگئی ہے

○○○

یہی اک وہم ہے جو اور کچھ جینے کی حسرت ہے
کہیں پر ہے کوئی ایسا جسے میری ضرورت ہے

بڑے اونچے سروں میں بولتے ہیں اب جو سناٹے
مرے خاموش رہنے پر بہت ان کو شکایت ہے

مزا ہی اور کچھ ہے دوستو جلنے پگھلنے میں
چلو دیکھیں بدن کی دھوپ میں کتنی تمازت ہے

اندھیرا جب گھنا ہوتا ہے کتنا ہول آتا ہے
تمہیں کیا علم تم کو جلد سو جانے کی عادت ہے

اداسی بال بکھرائے کھڑی ہے رات رستوں پر
تمہارے شہر میں بھی کیا کوئی مہتاب صورت ہے

ooo

پڑاؤ آئے کئی، ایک گھر نہیں آیا
کہ راس اب کے بھی ہم کو سفر نہیں آیا

کیا تھا خلق عجب آسمان آنکھوں نے
کہاں کا چاند ستارا نظر نہیں آیا

جو ایک بار گیا سبز پانیوں کی طرف
سنا گیا ہے کبھی لوٹ کر نہیں آیا

چراغ جلتے ہواؤں کی سرپرستی میں
ہمارے لوگو تمہیں یہ ہنر نہیں آیا

بھلا کے تجھ کو خجل ہوتے اور کیا ہوتا
بھلا ہوا کہ دعا میں اثر نہیں آیا

○○○

اے مسافر تنہا شام ہونے والی ہے
جلد لوٹ کے گھر جا شام ہونے والی ہے

بیٹھنے لگے آ کر کیا پرند شاخوں پر
دیکھ رقص پیڑوں کا شام ہونے والی ہے

آج پاؤں کے نیچے کوئی شے زمیں سی ہے
آج کیا غضب ہوگا شام ہونے والی ہے

ریت کے سمندر میں ایک ناؤ کاغذ کی
کیسے سچ ہوا سپنا شام ہونے والی ہے

جگمگا رہا ہے پھر آسمان چیخوں سے
اور ٹوٹا سناٹا شام ہونے والی ہے

دھند کے دریچے بھی بند ہونے والے ہیں
بھول جا کہ کیا دیکھا شام ہونے والی ہے

○○○

مجھے خواب آسماں سے پھر اتر جانے کو کہتی ہے
سنو تو نیند آنکھوں میں ٹھہر جانے کو کہتی ہے

ہر اک عالم میں جس نے درمیاں اک فاصلہ رکھا
وہی پرچھائیں اب حد سے گزر جانے کو کہتی ہے

جہاں بھی جب بھی ملتی ہے ہمیشہ زندگی مجھ سے
کوئی بالکل انوکھا کام کر جانے کو کہتی ہے

مجھے اس دشت میں سب کچھ میسر ہے مگر پھر بھی
کوئی آواز ہے جو روز گھر جانے کو کہتی ہے

عجب سی دھند تھی محفوظ جس نے رات سے رکھا
مگر اب وہ بھی مجھ کو چھوڑ کر جانے کو کہتی ہے

○○○

سورج کا جلنا، بجھ جانا، کھیل ہوا کے ہاتھ کا ہے
میرے شہر پہ اسی لیے تو سایہ کالی رات کا ہے

قید ہوں خود ہی اک مدت سے دوری کی دیواروں میں
کیا بتلاؤں کیسا رشتہ مجھ سے میری ذات کا ہے

ان جھلسے پودوں کو دیکھو آسمان کو تکتے ہیں
کہنے والوں کا کہنا ہے موسم یہ برسات کا ہے

میری طرح اس کی بھی آنکھیں خوف چمک سے خالی ہیں
یہ آہو، یہ وحشی آہو، شاید میرے ساتھ کا ہے

بدن ضرورت سے بھی زیادہ جسم ہوس پروان چڑھی
ہونا تھا جو وہی ہوا ہے شکوہ کیوں حالات کا ہے

○○○

حقیقت ہوں کہ بس اک واہما ہوں
یہ پوچھا جا رہا ہے مجھ سے کیا ہوں

بہت خوش اجنبی لوگوں سے مل کر
ہوا ہوں دوستو اکثر ہوا ہوں

یہاں سے کوئی گزرے گا نہیں کیا
کہ مدت سے یہاں تنہا کھڑا ہوں

کہاں پر ساتھ چھوڑا یادِ جاناں
سکوتِ شام سے ڈرنے لگا ہوں

مجھے اب بھی ہیں سورج سے امیدیں
اندھیروں تم سے جو میں لڑ رہا ہوں

کہوں گر ساتھ دیں الفاظ میرا
میں ان آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہوں

○○○

محفل میں بہت لوگ تھے میں تنہا گیا تھا
ہاں تجھ کو وہاں دیکھ کے کچھ ڈر سا گیا تھا

یہ حادثہ کس وقت کہاں کیسے ہوا تھا
پیاسوں کے تعاقب میں سنا دریا گیا تھا

آنکھیں ہیں کہ بس روزن دیوار ہوئی ہیں
اس طرح تجھے پہلے کبھی دیکھا گیا تھا

اے خلق خدا تجھ کو یقیں آئے نہ آئے
کل دھوپ تحفظ کے لیے سایا گیا تھا

وہ کون سی ساعت تھی پتہ ہو تو بتاؤ
یہ وقت شب و روز میں جب بانٹا گیا تھا

○○○

تری گلی سے دبے پاؤں کیوں گزرتا ہوں
وہ ایسا کیا ہے جسے دیکھنے سے ڈرتا ہوں

کسی افق کی ضرورت ہے میری آنکھوں کو
جو آج خلق نیا آسمان کرتا ہوں

بڑے جتن سے بڑے اہتمام سے تجھ کو
بھلا رہا ہوں محبت کا دم بھی بھرتا ہوں

اتارنا ہے مجھے قرض کتنے لوگوں کا
ذرا سکون ملے تو حساب کرتا ہوں

عجب نہیں کہ کسی یاد کا گہر مل جائے
گئے دنوں کے سمندر میں پھر اترتا ہوں

○○○

زمیں دامن کشاں ہے اب زیاں سے
اسی باعث ہے نسبت آسماں سے

بہت مصروف ہو تم وقت کم ہے
سناتے ہیں کہانی درمیاں سے

ہوا نے کردیا بے سمت پھر سے
جدا کشتی کو کر کے بادباں سے

مسافر سب وہیں اب تک کھڑے ہیں
چلے تھے مدتوں پہلے جہاں سے

جو پیاسے تھے سدا پیاسے رہیں گے
سمندر ڈھک گیا ریگِ رواں سے

بدلتے منظروں سے آنکھ حیراں
صدا خائف سکوتِ بیکراں سے

○○○

ایک ہی دھن ہے کہ اس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو نکلتا دیکھوں

اے جنوں تجھ سے تقاضا ہے یہی دل کا مرے
شہر امید کے نقشے کو بدلتا دیکھوں

یہ سفر وہ ہے کہ رکنے کا مقام اس میں نہیں
میں جو تھک جاؤں تو پرچھائیں کو چلتا دیکھوں

چاہے تاریکی مخالف ہو، ہوا دشمن ہو
مشعلِ درد کو ہر حال میں جلتا دیکھوں

وصل آثار کوئی لمحہ میسر آئے
ہجر کی ساعتِ بے مہر کو ٹلتا دیکھوں

○○○

ایسی تاریکی ہے میرا دل بہت گھبرائے ہے
خواب دیکھوں کس طرح میں، آنکھ کھل کھل جائے ہے

سو رہا ہے شہر سناٹوں کی چادر اوڑھ کر
میری یہ آواز دردر جائے ہے پچھتائے ہے

آرہے ہیں چند سائے دھند کے اس پار سے
دیکھنا ہے کون میری الجھنیں سلجھائے ہے

آج کا دن ہاں کوئی اچھا نہیں تسلیم ہے
آنے والا دن بہت بہتر ہے میری رائے ہے

○○○

یہ چاہتی ہے ہوا اس کو آزماؤں نہ میں
کوئی چراغ کہیں بھی کبھی جلاؤں نہ میں

سکوت سایہ رہے اس زمین پر ہر دم
کوئی صدا، کوئی فریاد لب پہ لاؤں نہ میں

یونہی بھٹکتا رہوں عمر بھر اداس اداس
سراغ بچھڑے ہوؤں کا کہیں بھی پاؤں نہ میں

سفر یہ میرا کسی طور مختصر ہو جائے
وہ موڑ آئے کہ جی چاہے آگے جاؤں نہ میں

بھلا تو دوں ترے کہنے پہ تجھ کو دل سے میں
مگر یہ شرط ہے تجھ کو بھی یاد آؤں نہ میں

○○○

وقفۂ جدائی کو اس کے نام کردو تم
اپنے دل کے اندر ہی بار بار جھانکو تم

کیا خبر کہ کب تم کو جلوہ اس کا مل جائے
خواب اچھے ہوتے ہیں خواب خوب دیکھو تم

وہ وہاں تھا، پھر یاں تھا اب کہاں ہے بتلاؤ
عکس اس کے سائے کا دیکھ کر نہ پھولو تم

اس نے اپنے ملنے کی اک جگہ نہیں طے کی
آسماں سے لوٹ آئے اب زمیں پہ ڈھونڈو تم

چاند اور ستاروں کی سانس پھول جاتی ہے
پھر بھی اے جنوں والو اس کی سمت دوڑو تم

○○○

جو پہلے خوب ہنسا زندگی پہ روئے گا اب
یہ آدمی کہ معمہ مثال ہوئے گا اب

ہزاروں راتیں جگا، خواب آنے والے تھے
نہیں ہیں خواب تو جی بھر کے خوب سوئے گا اب

جنوں کی فصلوں کو سرسبز دیکھنے کی سزا
ملے گی یوں کہ کہیں کچھ کوئی نہ بوئے گا اب

کیا ہے جو بھی کیا روح کے اشارے پر
بدن کے بوجھ کو تو بول کیسے ڈھوئے گا اب

○○○

نذرِ میرؔ

زندہ لوگوں سے کبھی کھل کے ملاقات کرو
کوئی دن اہلِ جہاں سیرِ خرابات کرو

کتنی تاریکی ہے احباب ہمیں رخصت دو
مشعلِ درد جلانی ہے ہوا ساتھ کرو

جانے کیا ٹوٹ رہا ہے کہیں، آواز سنو
اس کے بارے میں بتاؤ ہمیں، کچھ بات کرو

ہاں کرم خوب کرو اہلِ ہوس پر جاناں
جو ہمیں چاہتے ہیں ان کی بھی مدارات کرو

○○○

کٹے گا دیکھیے دن جانے کس عذاب کے ساتھ
کہ آج دھوپ نہیں نکلی آفتاب کے ساتھ

تو پھر بتاؤ سمندر صدا کو کیوں سنتے
ہماری پیاس کا رشتہ تھا جب سراب کے ساتھ

بڑی عجیب مہک ساتھ لے کے آئی ہے
نسیم رات بسر کی کسی گلاب کے ساتھ

فضا میں دور تلک مرحبا کے نعرے ہیں
گزرنے والے ہیں کچھ لوگ یاں سے خواب کے ساتھ

زمین تیری کشش کھینچتی رہی ہم کو
گئے ضرور تھے کچھ دور ماہتاب کے ساتھ

○○○
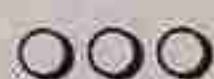
سنو خوش بخت لوگو لمحۂ نایاب آیا ہے
زمیں پر پیرہن پہنے بنا مہتاب آیا ہے

بنا سکتا ہے تم میں کوئی کاغذ ناؤ بتلاؤ
سنا ہے شہر میں اے شہریو سیلاب آیا ہے

○○○

جو منظر دیکھنے والی ہیں آنکھیں رونے والا ہے
کہ پھر بنجر زمیں میں بیج کوئی بونے والا ہے

بہادر لوگ نادم ہو رہے ہیں حیرتی میں ہوں
عجب دہشت خبر ہے شہر خالی ہونے والا ہے

○○○

سب سے جدا ہوں میں بھی، الگ تو بھی سب سے ہے
اس سچ کا اعتراف زمانے کو کب سے ہے

پھر لوگ کیوں ہمارا کہا مانتے نہیں
سورج کو خوف سایۂ دیوارِ شب سے ہے

○○○

دوست احباب کی نظروں میں برا ہو گیا میں
وقت کی بات ہے کیا ہونا تھا کیا ہو گیا میں

دل کے دروازے کو وا رکھنے کی عادت تھی مجھے
یاد آتا نہیں کب کس سے جدا ہو گیا میں

کیسے تو سنتا بڑا شور تھا سناٹوں کا
دور سے آتی ہوئی ایسی صدا ہو گیا میں

کیا سبب اس کا تھا خود مجھ کو بھی معلوم نہیں
رات خوش آ گئی اور دن سے خفا ہو گیا میں

بھولے بسرے ہوئے لوگوں میں کشش اب بھی ہے
ان کا ذکر آیا کہ پھر نغمہ سرا ہو گیا میں

نظمیں

بدن کے آس پاس

لبوں پہ ریت ہاتھوں میں گلاب
اور کانوں میں کسی ندی کی کانپتی صدا
یہ ساری اجنبی فضا
مرے بدن کے آس پاس آج کون ہے

نیند سے آگے کی منزل

خواب کب ٹوٹتے ہیں
آنکھیں کسی خوف کی تاریکی سے
کیوں چمک اٹھتی ہیں
دل کی دھڑکن میں تسلسل نہیں باقی رہتا
ایسی باتوں کو سمجھنا نہیں آسان کوئی
نیند سے آگے کی منزل نہیں دیکھی تم نے

خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں

دھول میں لپٹے چہرے والا
میرا سایہ
کس منزل، کس موڑ پہ بچھڑا
اوس میں بھیگی یہ پگڈنڈی
آگے جا کر مڑ جاتی ہے
کتبوں کی خوشبو آتی ہے
گھر واپس جانے کی خواہش
دل میں پہلے کب آتی ہے
اس لمحے کی رنگ برنگی سب تصویریں
پہلی بارش میں دھل جائیں
میری آنکھوں میں لمبی راتیں گھل جائیں

خواب کو دیکھنا کچھ برا تو نہیں

برف کی اجلی پوشاک پہنے ہوئے
ان پہاڑوں میں وہ ڈھونڈنا ہے مجھے
جس کا میں منتظر ایک مدت سے ہوں
ایسا لگتا ہے ایسا ہوا تو نہیں
خواب کو دیکھنا کچھ برا تو نہیں

سفر کی ابتدا نئے سرے سے ہو

سفر کی ابتدا نئے سرے سے ہو
کہ آگے کے تمام موڑ وہ نہیں ہیں
چیونٹیوں نے ہاتھیوں کی سونڈ میں پناہ لی
تھکے تھکے سے لگ رہے ہو
دھند کے غلاف میں ادھر وہ چاند ریگ آسمان سے
تمہیں صدائیں دے رہا ہے، سن رہے ہو
تمہاری یادداشت کا کوئی ورق نہیں بچا
تو کیا ہوا
گذشتہ روز و شب سے آج مختلف ہے
آنے والا کل کے انتظار کا
سجاؤ خواب آنکھ میں
جلاؤ پھر سے آفتاب آنکھ میں
سفر کی ابتدا نئے سرے سے ہو

زمین سے دور

اس خلا سے زمیں کا ہر گوشہ
جتنا دلکش دکھائی دیتا ہے
اس نے خوابوں میں بھی نہیں دیکھا
وہ نہیں آئے گا زمیں پہ اب

لمبی چپ کا نتیجہ

مرے دل کی خوف حکایت میں
یہ بات کہیں پر درج کرو
مجھے اپنی صدا سننے کی سزا
ملی لمبی چپ کی صورت میں
مرے بولنے میں جو لکنت ہے
اس لمبی چپ کا نتیجہ ہے

سوارِ بے سمند

زمین جس سے چھٹ گئی ہے
بابِ زندگی کا جس پہ بند ہے
وہ جانتا ہے یہ کہ وہ سوارِ بے سمند ہے
مگر وہ کیا کرے کہ اس کو آسماں کو جانے والا راستہ پسند ہے

عذاب کی لذت

پھر ریت بھرے دستانے پہنے بچوں کا
اک لمبا جلوس نکلتے دیکھنے والے ہو
آنکھوں کو کالی لمبی رات سے دھوڈالو
تم خوش قسمت ہو ایسے عذاب کی لذت
پھر تم چکھو گے

پانی کی دیوار کا گرنا

بامِ خلا سے جا کر دیکھو
دور افق پر سورج سایہ
اور وہیں پر آس پاس ہی
پانی کی دیوار کا گرنا
بولو تو کیسا لگتا ہے

سزا کی خواہش

میں نے تیرے جسم کے ہوتے
کیوں کچھ دیکھا
مجھ کو سزا اس کی دی جائے

کس طرح نکلوں

میں نیلے پانیوں میں گھر گیا ہوں
کس طرح نکلوں
کناروں پر کھڑے لوگوں کے ہاتھوں میں
یہ کیسے پھول ہیں
مجھے رخصت ہوئے تو مدتیں گزریں

تسلسل کے ساتھ

وہ ادھر سامنے ببول تلے
ایک پرچھائیں اور اک سایہ
اپنے جسموں کو یاد کرتے ہیں
اور سرگوشیوں کی ضربوں سے
اک تسلسل کے ساتھ وجد میں ہیں

صحرا کی حدوں میں داخل

صحرا کی حدوں میں داخل
جو لوگ نہیں ہو پائے
شہروں کی بہت سی یادیں
ہمراہ لیے آئے تھے

جو انسان تھا پہلے کبھی

شہر سارا خوف میں ڈوبا ہوا ہے صبح سے
رتجگوں کے واسطے مشہور اک دیوانہ شخص
ان سنی، ان دیکھی خبریں لانا جس کا کام ہے
اس کا کہنا ہے کہ کل کی رات کوئی دو بجے
تیز یخ بستہ ہوا کے شور میں
اک عجب دلدوز سہمی سی صدا تھی ہر طرف
یہ کسی بت کی تھی جو انسان تھا پہلے کبھی

مرے حافظے مرا ساتھ دے

کسی ایک چھت کی منڈیر سے
مجھے تک رہا ہے جو دیر سے
مرے حافظے مرا ساتھ دے
یہ جو دھند سی ہے ذرا ہٹا
کوئی اس کا مجھ کو سراغ دے
کہ میں اس کو نام سے دوں صدا

رینگنے والے لوگ

چلتے چلتے رینگنے والے یہ لوگ
رینگنے میں ان کے وہ دم خم نہیں

ایسا لگتا ہے کہ ان کو ذلتیں
مستحق مقدار سے کچھ کم ملیں

میں ڈرتا ہوں

میں ڈرتا ہوں
میں ڈرتا ہوں ان لمحوں سے
ان آنے والے لمحوں سے
جو میرے دل اور اس کے اک اک گوشے میں
بڑی آزادی سے ڈھونڈیں گے
ان خوابوں کو، ان رازوں کو
جنھیں میں نے چھپا کر رکھا ہے اس دنیا سے

اس اداس شام تک

لذتوں کی جستجو میں اتنی دور آ گیا ہوں
چاہوں بھی تو لوٹ کے جا نہیں سکوں گا میں
اس اداس شام تک
جو میرے انتظار میں
شام سے نہیں ملی

دیر تک بارش ہوتی

شام کو انجیر کے پتوں کے پیچھے
ایک سرگوشی برہنہ پاؤں
اتنی تیز دوڑی
میرا دم گھٹنے لگا
ریت جیسے ذائقے والی کسی مشروب کی خواہش ہوئی
وہ، وہاں کچھ دور اک آندھی چلی
پھر دیر تک بارش ہوئی

زندہ رہنے کی شرط

ہر ایک شخص اپنے حصے کا عذاب خود سہے
کوئی نہ اس کا ساتھ دے
زمیں پہ زندہ رہنے کی یہ ایک پہلی شرط ہے

عجیب کام

ریت کو نچوڑ کر پانی کو نکالنا
بہت عجیب کام ہے
بڑے ہی انہماک سے یہ کام کر رہا ہوں میں

منظر کتنا اچھا ہوگا

میں صبح سویرے جاگ اٹھا
تو نیند کی بارش میں بھیگا تنہا ہوگا
رستہ میرا تکتا ہوگا
منظر کتنا اچھا ہوگا

جینے کی ہوس

سفر تیری جانب تھا
اپنی طرف لوٹ آیا
ہر اک موڑ پر موت سے سابقہ تھا
میں جینے سے لیکن کہاں باز آیا

ایک سچ

شورِ سماعت کے درپے ہے جانتے ہو
موت کے قدموں کی آہٹ پہچانتے ہو
ہونی کو کوئی بھی ٹال نہیں سکتا
یہ اک ایسا سچ ہے تم بھی مانتے ہو

بدن پاتال

ہوس آکاش سے نیچے بھی اتروں
بدن پاتال میں تا دیر ٹھہروں
میں اپنے آپ کو جی بھر کے دیکھوں

تجھے کچھ یاد آتا ہے

میں تیرے جسم تک کن راستوں سے
ہو کے پہنچا تھا
زمیں آواز اور گندم کے خوشوں کی مہک میں
ساتھ لایا تھا
تجھے کچھ یاد آتا ہے

صبح سے اداس ہوں

ہوا کے درمیان آج رات کا پڑاؤ ہے
میں اپنے خواب کے چراغ کو
جلا نہ پاؤں گا یہ سوچ کے
بہت ہی بدحواس ہوں
میں صبح سے اداس ہوں

اے تنہائی

کچھ لوگ تو ہوں جو سچ بولیں
یہ خواہش دل میں پھر آئی
ہے تیرا کرم اے تنہائی

فرقہ پرستی

نیم پاگل لوگ
اس تعداد میں
کچھ اثر آئے مری فریاد میں

سزا پاؤ گے

بیچی ہے سحر کے ہاتھوں
راتوں کی سیاہی تم نے
کی ہے جو تباہی تم نے
کس روز سزا پاؤ گے

لمبے بوسوں کا مرکز

وہ صبح کا سورج جو تیری پیشانی تھا
مرے ہونٹوں کے لمبے بوسوں کا مرکز تھا
کیوں آنکھ کھلی، کیوں مجھ کو یہ احساس ہوا
تو اپنی رات کو ساتھ یہاں بھی لایا ہے

جاگنے کا لطف

ترے ہونٹوں پہ میرے ہونٹ

ہاتھوں کے ترازو میں

بدن کو تولنا

اور گنبدوں میں دور تک بارود کی خوشبو

بہت دن بعد مجھ کو جاگنے میں لطف آیا ہے

سچ بولنے کی خواہش

ایسا اک بار کیا جائے
سچ بولنے والے لوگوں میں
میرا بھی شمار کیا جائے

سحر کا خوف

شام کا ڈھلنا نئی بات نہیں
اس لیے خوف زدہ ہوں اتنا
آنے والی جو سحر ہے اس میں
رات شامل نہیں
یہ جانتا ہوں

جینے کی لت

مجھ سے ملنے آنے والا کوئی نہیں ہے
پھر کیوں گھر کے دروازے پر تختی اب ہے
جینے کی لت پڑ جائے
تو چھٹتی کب ہے

اجل کی نغمگی

چھپائی اس نے نہ مجھ سے کبھی کوئی بھی بات
میں رازدار تھا اس کا وہ غمگسار مرا
کئی جنم کا بہت پائیدار رشتہ تھا
مرے سوا بھی ہزاروں سے اس کی قربت تھی
شناخت اس کی اگر تھی تو بس محبت تھی
سفر میں زیست کے وہ تیز گام تھا اتنا
رکا نہ واں بھی جہاں پر قیام کرنا تھا
خبر یہ مجھ کو ملی کتنی دیر سے کہ اسے
اجل کی نغمگی مسحور کرتی رہتی تھی
دلِ کشادہ میں اس نے اجل کو رکھا تھا
عذابِ ہجر مقدر میں میرے لکھا تھا
سو باقی عمر مجھے یہ عذاب سہنا ہے
فلک کو دیکھنا ہر دم زمیں پہ رہنا ہے
خبر یہ مجھ کو ملی کتنی دیر سے کہ اسے
اجل کی نغمگی مسحور کرتی رہتی تھی

پار اترنے والوں میں

ساحل سے نظارہ کرنے والوں میں
میں بھی تھا دریا سے ڈرنے والوں میں
کاغذ کی کشتی میں لوگ بہت سے تھے
اک بس میں تھا پار اترنے والوں میں

اسعد بدایونی کی موت پر

خواہشِ مرگ کی سرشاری میں
یہ بھی نہیں سوچا
جینا بھی اک کارِ جنوں ہے اس دنیا کے بیچ
اور لمبے انجان سفر پر چلے گئے تنہا
پیچھے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے
مڑ کے نہیں دیکھا

باقیات

غزلیں

○○○

یہ سچ ہے سرابوں سے کچھ دور تھا پانی بھی
اور پیاس مخالف تھی دریا کی روانی بھی

لکھنے کو خطوں میں یوں دل حال سبھی لکھا
حسرت ہی رہی، تجھ سے کچھ کہتے زبانی بھی

تاریک بہت شب ہے اور وہ بھی بڑی لمبی
نیند آتی نہیں مجھ کو اب سن کے کہانی بھی

پوچھیں تو بھلا کس سے آنکھوں کی یہ حیرانی
اس شہر میں رہتا تھا وہ دشمنِ جانی بھی

چہرہ کوئی مجھ جیسا دکھلائی دیا جس دن
اس روز یقیں آیا ہوگا ترا ثانی بھی

○○○

جاگتا ہوں میں ایک اکیلا دنیا سوتی ہے
کتنی وحشت ہجر کی لمبی رات میں ہوتی ہے

یادوں کے سیلاب میں جس دم میں گھر جاتا ہوں
دل دیوار اُدھر جانے کی خواہش ہوتی ہے

خواب دیکھنے کی حسرت میں تنہائی میری
آنکھوں کی بنجر دھرتی میں نیندیں بوتی ہے

خود کو تسلی دینا کتنا مشکل ہوتا ہے
کوئی قیمتی چیز اچانک جب بھی کھوتی ہے

عمر سفر جاری ہے بس یہ کھیل دیکھنے کو
روح بدن کا بوجھ کہاں تک، کب تک ڈھوتی ہے

○○○

بھولی بسری یادوں کی بارات نہیں آئی
ایک مدت سے ہجر کی لمبی رات نہیں آئی

آتی تھی جو روز گلی کے سونے نکڑ تک
آج ہوا کیا وہ پرچھائیں ساتھ نہیں آئی

مجھ کو تعاقب میں لے آئی اک انجان جگہ
خوشبو تو خوشبو تھی میرے ہاتھ نہیں آئی

اس دنیا سے ان کا رشتہ کہ آدھا ادھورا ہے
جن لوگوں تک خوابوں کی سوغات نہیں آئی

اوپر والے کی من مانی کھلنے لگی ہے اب
مینہ برسا دو چار دفعہ برسات نہیں آئی

○○○

جو یہ سراب سمندر نما ابھی تک ہے
کسی کی پیاس سے رشتہ مرا ابھی تک ہے

زمین کو بھی یہیں آ کے ختم ہونا تھا
سفر ارادی مرا دور کا ابھی تک ہے

بجھا دیا مرے سورج کو میرے ہوتے ہوئے
یہ اور بات پشیماں ہوا ابھی تک ہے

یہاں پہ خوشبو وہاں روشنی ادھر آواز
شب فراق کوئی جاگتا ابھی تک ہے

گمان ہے کہ کہیں آس پاس پھر تو ہے
کہ مجھ سے میرا وہی فاصلہ ابھی تک ہے

○○○

آسماں کچھ بھی نہیں اب تیرے کرنے کے لیے
میں نے سب تیاریاں کرلی ہیں مرنے کے لیے

اس بلندی خوف سے آزاد ہو اس نے کہا
چاند سے جب بھی کہا نیچے اترنے کے لیے

اب زمیں کیوں تیرے نقشے سے نہیں ہٹتی نظر
رنگ کیا کوئی بچا ہے اس میں بھرنے کے لیے

یہ جگہ حیرت سرائے ہے کہاں تھی یہ خبر
یوں ہی آنکلا تھا میں تو سیر کرنے کے لیے

کتنا آساں لگ رہا ہے مجھ کو آگے کا سفر
چھوڑ آیا پیچھے پرچھائیں کو ڈرنے کے لیے

○○○

تکتی ہے مخلوق خدا مجھ کو حیرانی سے
میں نے تجھ کو بھلا دیا کتنی آسانی سے

اچھی بات نہیں ہے لیکن ایک حقیقت ہے
یوں ہی سا رشتہ ہے میری پیاس کا پانی سے

حال تیرے ماضی پر مجھ کو کتنا رشک آیا
کل جو اچانک ملنا ہوا اک یاد پرانی سے

ہر اک رات بڑی لمبی اور کالی لگتی ہے
میرے عہد کو نسبت کب ہے کسی کہانی سے

عہد زماں سے میں نے خود کو کر تو لیا آزاد
فرحت دیکھو کب ملتی ہے سیر مکانی سے

نظمیں

مجھ کو ملنا ہے وحید اختر سے

زندگی یہ ترا احسان بہت ہے مجھ پر
اعظمی زیست ہے ہر موڑ پہ جو ساتھ مرے
اس کی یادوں میں بسر ہوتے ہیں دن رات مرے
ایک احسان نیا کر مجھ پر
زندگی، موت سے تو میری سفارش کردے
مجھ کو ملنا ہے وحید اختر سے

اسرار

رات بھی جب مَیں نے دیکھا
آدھا دھڑ اس کا نظر آیا مجھے
اس سے پہلی رات بھی ایسا ہوا تھا
جانے کیا اسرار پوشیدہ ہے اس میں
وہ کبھی پورے بدن میں کیوں نہیں دکھلائی دیتی

میں بھی سولوں

بین کرتے ماتمی ملبوس پہنے لوگ
سڑکوں پہ ہمیشہ کی طرح نکلے ہیں
ان کو دیکھنے والوں میں اک بس میں ہوں
اور کوئی نہیں ہے
رات ڈھلنے میں ابھی کچھ وقت ہے
یہ سوچتا ہوں میں بھی سولوں

منیر نیازی کی وفات پر

اے شہرِ سخن تجھ ہونے کی
جو ایک نشانی باقی تھی
آوازِ منیر تھی
سن وہ بھی
اک لمبی چپ کی نذر ہوئی
اے شہرِ سخن تجھ سے میرا
کیا اب بھی کوئی رشتہ ہے
اس لمبی چپ سے آگے بھی
کوئی جادو ہے کوئی رشتہ ہے

اقبال صدیقی کی یاد میں

ہم تم دونوں ساتھ چلے تھے
یاد کرو وہ اچھے دن
پھر منزل پانے کی خاطر
ہم نے رستہ بدل لیا
اپنے اپنے ڈھنگ سے دونوں
جینے میں مصروف ہوئے
ملنے بچھڑنے کے وقفوں کی
گنتی ہم نے کی نہ کبھی
دوری کی یہ لمبی ساعت
کیسے بیچ میں آ پہنچی
تم کو بھلا دینے کی کوشش
میں نے کی اور ہار گیا

ہمایوں ظفر زیدی کی یاد میں

بہت محتاط لوگو
زندہ رہنے کے سوا تم نے کیا کیا ہے
محبت نام کی شے تم نے پائی ہے نہ پاؤ گے
یہاں محفل میں تم موجود ہو کر بھی نہیں سے ہو
منارہ نور کا وہ بن گیا ہے
پیار آنکھوں سے اسے دیکھو
دل شفاف ہیں اس کے
ہزاروں لوگ ہیں
بیوی ہے، بچّے ہیں
اور ان میں ایک میں بھی ہوں

شرد دت کے نام

اس عمر کے سفر کا
کتنا طویل رستہ
طے میں نے کر لیا ہے
اور اب بھی تازہ دم ہوں
بالکل نہیں تھکا ہوں
حیرت کی بات کیا ہے
تم میرے ساتھ میں ہو

کلکتہ ۲۰۱۰

اے مرے امید کے خوابوں کے شہر
میری آنکھوں کی چمک
آنے والے خوبصورت روز و شب کے اے امیں
سن کہ اب مخلوق تجھ سے خوش نہیں
میرے حق میں یہ سزا تجویز سب ہونے کو ہے
میں تجھے ویران ہوتے دیکھنے کے واسطے
اور بھی کچھ دن ابھی زندہ رہوں

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس ایک نظر میں

اقبالیات

کلیات اقبال اردو	(صدی ایڈیشن)	125/-
جلوۂ دانش فرنگ	عبدالرحیم قدوائی	81/-
دانشور اقبال	پروفیسر آل احمد سرور	150/-
اقبال فن اور فلسفہ	پروفیسر نورالحسن نقوی	50/-
اقبال شاعر و مفکر	پروفیسر نورالحسن نقوی	90/-
شکوہ جواب شکوہ مع شرح	علامہ اقبال	20/-
بانگ درا (عکسی)	علامہ اقبال	45/-
بال جبریل (عکسی)	علامہ اقبال	35/-
ضرب کلیم (عکسی)	علامہ اقبال	30/-
ارمغان حجاز (عکسی)	علامہ اقبال	20/-

غالبیات

دیوان غالب	مقدمہ پروفیسر نورالحسن نقوی	70/-
غالب: شاعر اور مکتوب نگار	پروفیسر نورالحسن نقوی	60/-
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	75/-

سرسید

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	پروفیسر ثریا حسین	200/-
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	پروفیسر نورالحسن نقوی	100/-
مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	80/-
سرسید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	90/-
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	50/-
سرسید کا سفرنامہ: مسافران لندن	پروفیسر اصغر عباس	250/-
مقالات سرسید احمد خاں	ڈاکٹر طارق سعید	50/-
سرسید اور ان کے کارنامے	پروفیسر نورالحسن نقوی	25/-
سرسید ایک تعارف	خلیق احمد نظامی	10/-

لسانیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	120/-
ادبی تنقید کے لسانی مضمرات	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	200/-
اردو زبان کی تاریخ	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	150/-
اردو کی لسانی تشکیل	پروفیسر مرزا خلیل بیگ	150/-
ہندوستانی لسانیات	سید محی الدین قادری زور	50/-
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	75/-

ادب و تنقید

جدید نظم: نظریہ و عمل	پروفیسر عقیل احمد صدیقی	350/-
نظریاتی تنقید: مسائل و مباحث	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	100/-
غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	75/-
سورج کو نکلتا دیکھوں (کلیات شہریار)	شہریار	500/-
سیف و سبو (مجموعہ کلام)	جوش ملیح آبادی	95/-
کلام فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	80/-
مرزا رسوا کی ناولیں: تنقید و تجزیہ	پروفیسر خورشید الاسلام	150/-
باقیات خورشید الاسلام	پروفیسر خورشید الاسلام	200/-
داستان کا فن	ڈاکٹر اطہر پرویز	200/-
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	پروفیسر صغیر افراہیم	200/-
نثری داستانوں کا سفر	پروفیسر صغیر افراہیم	200/-
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	محمد یسین	250/-
ریڈیو نشریات	زبیر شاداب	250/-
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	150/-
ترجمہ کا فن اور روایت	ڈاکٹر قمر رئیس	200/-
تصویریں پیاروں کی (خاکے)	پروفیسر نورالحسن نقوی	120/-
خواب باقی ہیں (خودنوشت)	آل احمد سرور	200/-
رشید احمد صدیقی کے خطوط	آل احمد سرور	180/-
کچھ خطبے کچھ مقالے	آل احمد سرور	150/-
افکار کے دیے	آل احمد سرور	200/-
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	150/-
مجنوں گورکھپوری: حیات و ادبی خدمات	ڈاکٹر شاہین فردوس	250/-
مسلم یونیورسٹی کی کہانی	افتخار عالم	200/-
اردو ادب میں خاکہ نگاری	صابرہ سعید	250/-
ہماری شاعری	سید مسعود حسن رضوی	80/-
نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ	اشفاق محمد خاں	80/-
فن تنقید اور تنقید نگاری	پروفیسر نورالحسن نقوی	50/-
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	75/-
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	90/-
جدید غزل	رشید احمد صدیقی	50/-
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	80/-
تفہیم ادب	شائستہ نوشین	125/-
غزل و درس غزل	اختر انصاری	50/-
غزل کی سرگزشت	اختر انصاری	40/-
اردو ادب میں طنز و مزاح	وزیر آغا	100/-
تاریخ ادب اردو	پروفیسر نورالحسن نقوی	80/-
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	60/-
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	90/-
اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	80/-
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	150/-
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	45/-
اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	50/-
اردو مرثیہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	60/-

شہریار کی پیدائش 16 رجون 1936 کو آنولہ ضلع بریلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ہردوئی میں حاصل کی۔ 1966 میں شعبۂ اردو (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں لکچرر ہوئے۔ 1996 میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔

پروفیسر شہریار کا نام جدید اردو شاعری کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔ ان کی شاعری پر ہر مکتبۂ فکر کے ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ شہریار کی شاعری داخلی اعتبار سے اتنا پرقوت ہے کہ وہ بہ یک وقت مختلف مسائل اور رجحانات کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ یہ امتیاز شہریار کے معاصرین میں شاید بڑی حد تک شہریار ہی کو حاصل ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے لکھا تھا کہ ''شہریار کو بلیغ خاموشیوں کا ہنر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ آتا ہے اور ان کی نظمیں دراصل آخری مصرعے سے شروع ہوتی ہیں کیوں کہ وہ ایک نئی کیفیت کے کنارے پہنچا کر بظاہر ختم ہو جاتی ہیں لیکن حقیقت میں اپنے عمل کو شروع کرتی ہیں۔'' انسان کے داخلی تضادات، فرض کی حسی اور جذباتی کشمکش اور اخلاقی اقدار کی شکست کا جیسا شدید احساس شہریار کی شاعری میں ملتا ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ شہریار کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پانچ مجموعوں پر مشتمل کتاب ''حاصلِ سیر جہاں'' 2004 میں شائع ہوئی تھی۔ 2008 میں سنگ میل پبلی کیشنز پاکستان سے شہریار کا کلیات شائع ہوا جس میں ان کے چھ مجموعے شامل تھے۔ ''دھند کی روشنی'' کے نام سے ساہتیہ اکیڈمی نے شہریار کا منتخب کلام بھی شائع کیا ہے۔ دیوناگری میں ان کا بیشتر کلام منظر عام پر آچکا ہے۔ فرانسیسی، جرمن، روسی، مراٹھی، بنگالی، تیلگو اور انگریزی میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ شہریار کو مختلف ادبی مراکز، اداروں اور تنظیموں نے اپنے اعزازات سے نوازا ہے۔ ملک کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ گیان پیٹھ سے بھی انھیں سرفراز کیا گیا۔ ساہتیہ اکیڈمی، دہلی اردو اکیڈمی، یوپی اردو اکیڈمی، ادبی سنگم، ساہتیہ منچ، فراق سمان اور میکش اکبرآبادی ایوارڈ سے ان کو نوازا جا چکا ہے۔ این سی ای آر ٹی، گیان پیٹھ ایوارڈ، ساہتیہ اکیڈمی، سرسوتی سمان اور اقبال سمان کے ججوں کی کمیٹیوں میں وہ اپنی اصابت رائے کا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔ فرانس، اٹلی، بلجیم، امریکہ، مسقط، دبئی، سعودی عرب، قطر، پاکستان وغیرہ کے ادبی اجتماعات میں متعدد بار ہندوستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

13 رفروری 2012 کو علی گڑھ میں شہریار کا انتقال ہوا۔